S-75
کابلی والا
رابندر ناتھ ٹیگور

سٹار پاکٹ بکس سیریز — ۷۵
کابلی والا
رابندر ناتھ ٹیگور

ناشر:
سٹار پبلیکیشنز
۲۷۱۵۔ دریا گنج، دہلی ۶

قیمت ایک روپیہ

سول ایجنٹ:
پنجابی پستک بھنڈار
دریبہ کلاں۔ دہلی ۶

S-75 KABULIWALA RE:1.00

ترتیب

سٹار پاکٹ بکس سیریز
کے ساتویں نئے سیٹ کی

بارہ فنی کتابیں!

۶۹۔ رعنائیاں شاعری شکیل بدایونی
۷۰۔ ٹوٹے پنکھ ناول گلشن نندہ
۷۱۔ دلہن " جاوید رشید
۷۲۔ جنکشن پلارا " اکرم الہ آبادی
۷۳۔ عشق نہ دیکھے " کوثر چاندپوری
۷۴۔ پرائی ماں " نانک سنگھ
۷۵۔ کابلی والا کہانیاں نانک سنگھ
۷۶۔ سونے کی عورت ناول راتم صدیقی
۷۷۔ بُری بات " گورودت
۷۸۔ سمٹتے سائے " جگدیش بھارتی
۷۹۔ تبسم تبسم لطیفے فلم سٹار تبسم
۸۰۔ اردو شاعری ۱۹۶۰ء کا انتخاب

سابقہ ۶۸ کتابوں کیلئے فہرست طلب فرمائیں

کابلی والا

میری پانچ سال کی چھوٹی لڑکی لمحہ بھر کیلئے کبھی خاموش نہیں رہ سکتی —— اس دنیا میں جنم لینے کے بعد اُس نے بولنا سیکھنے میں صرف ایک سال ہی لگایا تھا۔ اس کے بعد سے جب تک وہ جاگتی رہتی ہے۔ ایک لمحہ بھی خاموش رہ کر ضائع نہیں کرتی۔ اُس کی ماں اکثر دھمکا کر اُس کا مونہہ بند کر دیتی ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا۔ منی کے خاموش رہنے سے کچھ ایسا عجیب سا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ عرصہ برداشت نہیں ہوتا۔ اسلئے میری اُس کی گفتگو بہت زور شور کے ساتھ چلتی ہے۔

علی الصبح میں نے اپنے ناول کے سترھویں باب کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ منی نے آتے ہی شروع کر دیا۔

"بابوجی! رام دیال دربان "کاگ" کو کوا کہتا تھا —— وہ کچھ نہیں جانتا۔ ٹھیک ہے نا —— ؟"

دنیا کی مختلف زبانوں کے بارے میں میں اُسے کچھ بتانا ہی چاہتا تھا کہ اُس کا موضوع

بدل گیا۔ کہنے لگی۔

"دیکھو بابوجی ۔۔۔! بھولا کہتا تھا کہ ہاتھی آسمان سے سونڈ میں بھر کر پانی گراتا ہے۔ اس سے بارش ہوتی ہے ۔ بھولا اس طرح جھوٹے موٹے بکواس کرتا ہے صرف بکتا ہے۔ دن رات بکتا ہے ۔۔۔"

اس بارے میں مجھے اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیئے بنا ہی وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"بابوجی! ماں تمہاری کون ہوتی ہے؟"

"سالی ۔۔۔!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ پھر بولا۔ "گنّی ۔۔۔! تم بھولا کے ساتھ کھیل ۔۔۔! جایئے اس وقت کام ہے ۔۔۔!!"

اس کے بعد فوراً ہی اس نے میرے لکھنے کی میز کے قریب پاؤں کے پاس بیٹھ کر اپنے دونوں گھٹنوں اور ہاتھوں کو لے کر تیزی سے اگرام بگرام کھیلنا شروع کر دیا۔ میرے سترھویں باب کا پرتاپ سنگھ اس وقت چھتن مالا کو لے کر اندھیری رات میں قیدخانہ کی اونچی کھڑکی سے نیچے بہنے والے دریا میں کود رہا تھا

میرا گھر سڑک کے کنارے ہے۔ اچانک ہی گنّی "اگرام بگرام" کھیل چھوڑ کر کھڑکی کے پاس جا پہنچی اور زور زور سے پکارنے لگی۔

"کابلی والا ۔۔۔ او کابلی والا ۔۔۔!!"

میلے کچیلے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے، سر پہ پگڑی باندھے، گٹھری رکھے۔ ہاتھ میں دو چار انگور کی پٹاری لئے ایک دراز قد کابلی والا سڑک پر دھیرے دھیرے چلا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری لڑکی کے دل میں کس قسم کے جذبات پیدا ہوئے ۔۔۔ بتانا مشکل ہے۔ اس نے آواز بلند پکارنا شروع کر دیا۔ میں نے سمجھا اس وقت ایک جھولی لٹکائے مصیبت سامنے آ کھڑی ہوگی۔ میرا سترھواں باب

اب ختم نہیں ہو گا۔

لیکن منی کی آواز پر کابلی والا تو جیسے ہی ہنس کر مونہہ پھیرا اور میرے گھر کی طرف آنے لگا۔ ــــــ اس وقت وہ گہرا لمبا سانس کھینچتی ہوئی گھر کے اندر بھاگ گئی۔ پھر اُس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس کے دل میں ایک اعتقاد سا بیٹھ گیا تھا کہ اُس کی جھولی کے اندر تلاش کرنے پر اُس کے اندر سے اُس جیسے ہی دو تین بچے مل سکتے ہیں۔

ادھر کابلی والا آکر مسکراتا ہوا سلام کر کے میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوچا ــ اگرچہ پرتاپ سنگھ اور کنچن مالا کی حالت انتہائی نازک ہے۔ پھر بھی اس شخص کو گھر بلا کر اس سے کچھ نہ خریدنا مناسب نہ ہو گا۔

کچھ خرید لی گئی ــــ اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ روس اور انگریز سے لے کر سرحدوں کی حفاظت سے متعلق پالیسی پر گپیں چلنے لگیں ــــ

آخر میں اُٹھ کر جاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"بابوجی! ــــ آپ کی لڑکی کہاں گئی ــــ؟"

میں نے منی کے دل میں بیٹھے ہوئے خوف کو دور کرنے کے خیال سے اُسے اندر بلوا لیا۔ وہ مجھ سے بالکل چپکی ہوئی کابلی والے اور جھولی کی طرف استعجابیہ نظروں سے دیکھتی ہوئی کھڑی رہی۔ کابلی نے جھولی سے کشمش اور خوبانی نکال کر اُسے دینا چاہا۔ لیکن اُس نے کچھ نہیں لیا۔ اور وہ اور بھی زیادہ مشکوک انداز سے گھورتی ہوئی میرے گھٹنوں سے چمٹی کھڑی رہی۔ پہلا تعارف اس طرح ہوا۔

چند دن بعد ایک روز سویرے کے وقت کسی ضروری کام سے مکان سے باہر نکلتے وقت میں نے دیکھا۔ میری لڑکی دروازے کے نزدیک بچھے تخت کے اوپر بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہے۔ کابلی والا اُس کے پاؤں کے پاس بیٹھا ہوا لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے اُنہیں سن رہا ہے۔ اور کبھی کبھی درمیان میں وہ تعریف و توصیف سے پر ٹوٹی ہوئی

بنگالی زبان میں اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہے۔ منی کو اپنی پانچ سالہ زندگی میں اپنے بابا کو چھوڑ کر اس طرح اطمینان کے ساتھ اس کی تقریر سننے والا کوئی نہیں ملا تھا۔ یہ بھی دیکھا کہ اس کا چھوٹا سا آنچل بادام اور کشمش سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کابلی والا سے کہا۔ "اسے یہ سب کیوں دیا ۔۔۔ ؟ اور مت دینا ۔۔۔!" یہ کہہ کر میں نے جیب سے ایک اٹھنی نکال کر اسے دے دی اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اٹھنی لے کر جھولی میں ڈال لی۔

گھر واپس آنے کے بعد دیکھا کہ اس اٹھنی کی وجہ سے ایک زبردست ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے۔

منی کی ماں ایک سفید چمکیلی سی شے ہاتھ میں لئے ہوئے انتہائی غضبناک تیز و تند لہجہ میں پوچھ رہی تھی۔

"تجھے یہ اٹھنی کہاں سے ملی ؟"

"کابلی والا نے دی ہے !" منی کہہ رہی تھی۔

"تو نے کابلی والا سے اٹھنی کیوں لی ۔۔۔ ؟" اس کی ماں نے کھچ سے سوال کیا۔

"میں نے مانگی نہیں تھی۔ اس نے خود ہی دی ہے۔" منی گلوگیر آواز میں بولی۔ میں نے آکر منی کو اس کشمکش سے نجات دلائی اور اسے باہر لے گیا۔

مجھے پتہ چلا کہ منی کے ساتھ کابلی والا کی یہ پہلی ملاقات تھی ایسی بات نہیں۔ اس نے اس درمیان میں روزانہ آکر اندلسیۃ بادام کی رشوت دے کر منی کے چھوٹے سے معصوم دل پر قبضہ کر لیا تھا۔

ایک دن دیکھا ان دونوں دوستوں کے درمیان چند مخصوص باتیں اور ہنسی مذاق چل رہا ہے ۔۔

منّا اگر رحمت کو دیکھتے ہی میری لڑکی پوچھنے لگتی تھی۔

"کابلی والا ــــ اے کابلی والا ــــ! تمہاری اس جھولی میں کیا ہے ــ؟"

رحمت ہنستے ہنستے جواب دیتا۔

"ہاتھی ــــ!!"

یعنی اس کی جھولی کے اندر ایک ہاتھی ہے۔ اس کے مذاق کرنے کا یہی ایک موضوع تھا۔ اہم موضوع ــــ یہ موضوع کس قدر اہم تھا، کہہ نہیں سکتا۔ پھر بھی اس قسم کے مذاق سے دونوں کو ایک خاص قسم کا قلبی سکون محسوس ہوتا۔ اور سرد یول کی صبح کو ایک بزرگ اور معصوم بچے کے درمیان لطیف مذاق کو دیکھ کر مجھے بھی بہت خوشی محسوس ہوتی تھی۔

اُن کے درمیان ایک بات اور بھی چل رہی تھی۔ رحمت منی سے کہتا۔

"بچی ــــ تم سسرال کبھی مت جانا ــــ!!"

بنگالی گھرانے کی لڑکیاں جنم سے ہی "سسرال" لفظ سے واقف ہو جاتی ہیں۔ مگر ہم لوگ قدرے ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے چھوٹے بچوں کو سسرال کے بارے میں کچھ واقفیت بہم نہیں پہونچا سکتے تھے اسلئے رحمت کے اصرار کو وہ ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ پاتی تھی۔ لیکن کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر خاموش رہ جانا اُس کی عادت اور مزاج کے منافی تھا۔ بلکہ وہ رحمت ہی سے پوچھنے لگتی۔

"تم سسرال جاؤ گے؟"

رحمت تخیلی سسر کے تئیں گھونسہ تان کر کہتا۔

"میں سسر کو مار دوں گا ــ"

یہ سُن کر منی سسر نامی کسی ناواقف شخص کی حالتِ غیر کا اندازہ لگا کر خوب ہنسا کرتی تھی۔

اسی طرح سردیاں اپنے عروج پر آگئی تھیں۔ زمانۂ قدیم میں راجہ اور مہاراجہ اسی موسم میں علاقہ جات فتح کرنے کیلئے نکلا کرتے تھے۔ میں کلکتہ چھوڑ کر کبھی کہیں نہیں جاتا صرف اس لئے کہ میرا دل ساری زمین کے گرد گھومتا ہے۔ میں اپنے گھر کے تنہا گوشوں کا مکین ہوں۔ لیکن باہری دنیا کیلئے میرا دل ہمیشہ بے قرار رہتا ہے.... کسی غیر ملک کا نام سنتے ہی میرا دل اُڑنے لگتا ہے۔ اسی طرح کسی غیر ملکی باشندے کو دیکھتے ہی دل میں ندیاں، پہاڑ، اور جنگلوں کے درمیان ایک جھونپڑی کا منظر ابھر آتا ہے اور ایک اُمنگ بھری آزاد حسین جیون یاترا کی بات تخیل میں رقص کرنے لگتی ہے۔

اور دوسری جانب میرا مزاج ایسا ہے کہ اپنے گھر کے تنہا گوشے کو چھوڑ کر ایک بار باہر نکلنے پر گویا مجھ پر بجلی سی گر پڑتی ہے۔ [illegible] صبح اپنے چھوٹے سے کمرے میں میز کے سامنے بیٹھ کر اس کابلی کے ساتھ گپیں لگاتے ہوئے میرے اس کرۂ ارض سے متعلق کئی کام پورے ہو جاتے ہیں۔ دونوں طرف اونچے کھڑے لال رنگ کی بلند پہاڑی چوٹیوں کا سلسلہ ہے۔ درمیان میں سنگلاخ راستے ہیں۔ اس راستے پر مال سے لدی ہوئی اونٹوں کی قطاریں جا رہی ہیں۔ پگڑی باندھے ہوئے سوداگر اور سیاح، کوئی اونٹ پر سوار ہے کوئی پیدل ہی چلا جا رہا ہے۔ کسی کے ہاتھوں میں برچھا ہے تو کسی کے ہاتھ میں پرانے زمانے کی چقماق تیر چڑھی ہوئی بندوق ہے ـــــ بادلوں کی سی گرجدار آواز میں کابلی ہماری ٹوٹی پھوٹی بولی میں اپنے ملک کی باتیں کرتا ہے۔ اور یہ منظر میری نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتا تھا۔

منی کی ماں بہت زیادہ شکی مزاج کی ہے۔ راستے میں کوئی ایک لفظ سن کر اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے سارے شرابی [illegible] مکان کی ہی منزل

سمجھ کر ادھر ہی چلے آرہے ہیں۔ یہ دُنیا صرف چھوٹے ڈاکوؤں، لیٹروں، شرابیوں گیر کے
مکوڑوں، تل چٹے اور گوردوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہی خام خیالی اتنے دنوں سے
دیہت زیادہ دلوں سے نہیں) زمین پر رہتے ہوئے کبھی اُس کے دل سے دور
نہیں ہوتی۔

رحمت کابلی والے کے بارے میں وہ مکمل طور پر بے فکر نہیں تھی۔ رحمت
کے تئیں اُس کے دل میں شکوک اجاگر رہتے۔ اُس پر کڑی نظر رکھنے کے بارے
میں اُس نے مجھ سے کئی بار کہا تھا۔ میں نے اُس کے شک کو ہنسی میں اُڑانے کی
کوشش کی۔ تو اُس نے دوہراتے ہوئے ایک ساتھ مجھ سے کئی سوال کر ڈالے۔
کیا کبھی کسی کا بچہ چوری نہیں گیا ـــــ؟ کیا کابل میں غلاموں کی تجارت عام نہیں
ہے ـــــ؟ ایک موٹے تازے کابلی کیلئے ایک چھوٹے بچے کو چرا کر لے جانا
کیا بالکل ہی غیر ممکن ہے ـــــ؟

مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ یہ باتیں ناممکن ہو سکیں ایسی بات تو نہیں۔ لیکن ان پر یقین
کبھی نہیں کیا جا سکتا۔ یقین کرنے کی شکتی سب میں ایک جیسی نہیں ہوتی۔ اسلئے
میری بیوی کے دل میں خوف بنا رہا۔ لیکن میں صرف اس وجہ سے بدستور رحمت
کو اپنے مکان میں آنے سے منع نہیں کر سکا۔

ہر سال فروری کے مہینہ میں رحمت اپنے دیش چلا جاتا ہے۔ اس وقت
وہ اپنے تمام مقروضوں سے قرض کے روپے وصول کرنے میں مصروف
رہتا ہے۔ وہ گھر گھر گھومتا۔ لیکن پھر بھی منی کو ایک بار ضرور دیکھ جاتا ـــــ
بظاہر دیکھنے سے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی گہری
سازش چل رہی ہے۔ جس دن وہ علی الصبح نہیں آ پاتا اُس دن دکھیا جاتا کہ وہ
شام کو آ نکلتا ہے۔ اندھیرے میں، گھر کے تاریک کونے میں اُس ڈھیلے ڈھالے

جامہ پاجامہ پہنے ہوئے جھولا جھولی والے دراز قد شخص کو دیکھ کر، درحقیقت دل میں ایک انجانا شک پیدا ہو جاتا۔ لیکن فوراً یہ دکھائی دیتا کہ منی ۔" کابلی والا ۔ اے کابلی والا ۔" پکارتی ہوئی ہنستے ہنستے دوڑی آتی اور دونوں مختلف العمر دوستوں کے درمیان پرانا لطیف مذاق چلنے لگتا اُس وقت میرا دل انتہائی خوشی محسوس کرتا۔

ایک دن میں صبح اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا پروف شیٹ میں ترمیم کر رہا تھا رخصت ہونے سے قبل آج دو تین دن سے جاڑا بڑی زور سے پڑ رہا تھا ۔ چہار سو ایک بار ہاہا کار مچ گئی تھی ۔ کھڑکی میں ہو کر جب صبح کی دھوپ میز کے نیچے میرے پاؤں پر آگر پڑی تو اُس کی تپش مجھے بہت بھلی محسوس ہونے لگی ۔ اُس وقت آٹھ بجے ہوں گے ۔ اُسی وقت راستے میں بھاری شور و غل سُنائی دیا۔

دیکھا ہمارے رحمت کو دو پہرے والے سپاہی باندھ کر لئے آرہے ہیں۔ اُس کے پیچھے شرارتی بچوں کی بھیڑ چلی آرہی تھی۔ رحمت کے جسم کے کپڑے خون میں لت پت تھے ۔ اور پہرے والے ایک سپاہی کے ہاتھ میں خون آلود چھرا تھا۔ میں نے پہرے والے سپاہی کو دروازے سے باہر نکل کر روکا اور اُس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے ؟"

کچھ اس پہرے والے سپاہی سے اور کچھ رحمت کی زبانی پتہ چلا کہ ہمارے ایک پڑوسی نے رحمت سے لاہوری چادر خریدتے وقت کچھ روپے اُدھار کر لئے تھے ۔ اب اُس نے جھوٹ بول کر دینے سے انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے بات اس قدر بڑھ گئی کہ اس نے اُس کے چھرا گھونپ دیا۔

رحمت اس بے ایمان آدمی کو طرح طرح کی فحش گالیاں دے رہا تھا۔

اُسی وقت "کابلی والا۔ او کابلی والا ـــ" کہہ کر پکارتی ہوئی منی گھر سے باہر نکل آئی۔

رحمت کا چہرہ لمحہ بھر میں ہی دیکھتے دیکھتے خوشی اور مسرت سے تمتما اُٹھا آج اُس کے کاندھے پر جھولی نہیں تھی۔ اسی لئے جھولی سے متعلق کوئی بات چیت نہیں ہو سکی۔ منی نے آتے ہی اُس سے پوچھا۔

"تم سسرال جاؤ گے ـــــ؟"

"وہیں جا رہا ہوں ـــــ" رحمت نے ہنستے ہوئے کہا۔

جب اُس نے دیکھا کہ یہ جواب سُن کر منی خوش نہیں ہوئی تو اُس نے اپنے ہاتھ دکھلاتے ہوئے کہا۔

"سسر کو مارتا۔ لیکن کیا کروں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ـــ"

اقدامِ قتل کے الزام میں رحمت کو کئی سال قیدِ سخت کی سزا ملی۔

اُس کی ساری باتیں کچھ ہی دنوں میں بالکل ہی بھول گیا۔ جس وقت ہم لوگ گھر میں بیٹھے حسبِ معمول اپنے روزمرّہ کے کاموں میں مصروف رہ کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُس وقت ایک قیدی۔ ایک تحیم شحیم شخص قیدخانہ کی دیواروں کے اندر کس طرح جیون بسر کر رہا ہو گا ـــ یہ بات ہمارے دل میں کبھی نہ آئی۔

اور شوخ و شنگ منی اب قدرے شرمیلی ہو گئی تھی۔ یہ بات اُس کے باپ کو بھی ماننی پڑے گی۔ اُس نے آسانی سے اپنے پرانے راستہ کو بھُلا کر پہلے تو نبی نامی سائیس سے دوستی قائم کی۔ ازاں بعد جوں جوں اُس کی عمر بڑھتی گئی ویسے ہی اُس کے دوستوں کے بدلے ایک ایک کر کے سہیلیاں اکٹھی ہونے لگیں یہی کیوں اب اُسے اپنے بابا کے لکھنے کے کمرے میں بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا

لیے تو ایک طرح سے اُس سے تعلقات ہی ٹوٹ گئے تھے۔

کتنے ہی سال گذر گئے۔ ایک بار پھر موسم سرما آ گیا۔ میری منی کا شادی کا رشتہ طے ہو گیا۔ پوجا کی چھٹیوں میں اُس کی شادی ہو گی۔ کیلاش واسنی کے ساتھ ساتھ ہمارے گھر کی رونق منی بھی پتا کے گھر کو تیرہ و تار کر کے پتی کے گھر کی یاترا کرے گی۔

صبح اپنی تمام تر دلکشیوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ بارش کے بعد موسم سرما کی یہ نئی دھلی ہوئی دھوپ گویا سہاگہ میں گلے ہوئے سونے کی مانند رنگ اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہی کیوں کلکتہ کی گلیوں کے اندر بھی، ٹوٹے ہوئے، خستہ حال پرانے مکانوں کے اوپر بھی اس دھوپ کی چمک ایک عجیب دلفریب منظر پیش کر رہی ہے۔

ہمارے گھر میں آج رات ختم ہونے سے پہلے ہی شہنائی بج رہی ہے۔ وہ سُر جیسے میرے کلیجے کی ہڈیوں کے درمیان رہ رہ کر گونج اُٹھتا ہے۔ اندوہناک بھیروں راگنی آج میرے دل کی انتھاہ گہرائیوں میں اُترتی جا رہی ہے ــــ آج میری منی کی شادی ہے۔

صبح سے ہی شور و غل مچا ہوا ہے ــــــ لوگوں کی آمد و رفت جاری ہے۔ آنگن میں بانس باندھ کر منڈپ بنایا جا رہا ہے۔ مکان کے ہر ایک کمرے اور برآمدے میں جھاڑ فانوس آویزاں کرنے کی آوازیں اُمنڈ رہی ہیں۔ چیخ و پکار کی تو کوئی حد نہیں ہے۔

میں اپنے لکھنے کے کمرے میں بیٹھا ہوا سب دیکھ رہا تھا۔ اُسی وقت رحمت آیا اور سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

پہلے میں اُسے پہچان نہ سکا۔ [illegible] اُس کے جسم

میں پہلے کی طرح وہ شرارت نہیں تھی۔ آخر میں اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر میں اُسے پہچان سکا۔ میں نے کہا۔

"کیوں بھئی رحمت! کب آیا ـــ؟"

"کل شام کو جیل سے رہا ہوں ـــ" وہ بولا۔

اُس کی یہ آواز سنتے ہی میرے کانوں میں کھٹ کی سی آواز گونج اُٹھی۔ میں نے کسی خونی کو کبھی اپنے پاس نہیں دیکھا تھا۔ اُسے دیکھ کر میرے تمام وجود پر ایک عجیب قسم کی سنسناہٹ سی چھا گئی ـــ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی ـــ آج کے مبارک دن یہ شخص یہاں سے جلد ہی چلا جائے تو بہتر ہے۔

"میں نے اُس سے کہا۔

"آج ہمارے گھر میں ایک کام ہے۔ میں مصروف ہوں ـــ تم آج جاؤ"

یہ بات سنتے ہی وہ اُسی وقت وہاں سے جانے کو تیار ہو گیا ـــ آخیر میں دروازے کے پاس پہونچ کر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

"بچی کو ایک بار دیکھ نہیں سکوں گا ـــ ؟"

اُس کے دل کو شاید یقین تھا کہ منی اُسی طرح کی ہے۔ اُس نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ منی اب کبھی پہلے کی طرح "کابلی والا ـــ او کابلی والا ـــ!!" کہتی ہوئی دوڑی چلی آئے گی۔ اُس کی شوخ و شنگ طبیعت اور شرارتی عادت میں بالکل تبدیلی نہیں ہوئی ہوگی ـــ صرف اتنا ہی نہیں، پُرانی دوستی کا خیال کر کے وہ ایک پٹاری میں انگور اور کاغذ کے تھیلے میں تھوڑے سے کشمش، بادام رکھ کر شاید وہ اپنے دیش کے کسی شخص سے مانگ کر آیا تھا۔ اُس کی اپنی جھولی اس کے پاس نہیں تھی۔

"آج گھر میں کام ہے آج کسی سے بھی ملاقات نہ ہو سکے گی۔"

وہ قدرے جھلا گیا ـــــ سکتے کے عالم میں کھڑے رہ کر ایک بار ٹھہری ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور آخر میں "بابو سلام" کہہ کر دروازے سے باہر ہو گیا۔

میرے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی ـــــ خیال پیدا ہوا ـــ اُسے واپس بُلا لوں ـــ اُسی وقت دیکھا۔ وہ خود ہی لوٹ کر آ رہا ہے ـــــ

نزدیک آ کر بولا۔

"یہ انگور، اور تھوڑے سے کشمش بادام بچی کے لیے لایا تھا ـــــ اُسے دیتے رہیے گا ـــ"

میں اُن چیزوں کو لے کر اُن کی قیمت دینے لگا۔ تبھی اچانک اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"آپ کی بہت مہربانی ہے۔ یہ مجھے تا ابد یاد رہے گی۔ مجھے یہ مت دیجئے بابو ـــــ! جیسی آپ کی ایک بچی ہے۔ ویسی ہی میرے ملک میں میری بھی ایک لڑکی ہے ـــ اُس کے چہرے کو یاد کر کے میں اپنی بچی کے لئے تھوڑا بہت میوہ لاتا رہا ہوں ـــــ میں یہاں کاروبار کے لئے نہیں آتا ـــ"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے ڈھیلے کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر سینے کے پاس کہیں سے کاغذ کا ایک میلا سا پُرزہ باہر نکالا۔ بڑی احتیاط سے اُس کی تہہ کو کھول کر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اُسے میری میز پر رکھ دیا۔

دیکھا، کاغذ کے اوپر ایک ننھے سے ہاتھ کی چھاپ ہے، فوٹوگراف نہیں ـــ آئل پینٹنگ نہیں ـــ ہاتھ کے اوپر تھوڑی سی سیاہی لگا کر کاغذ کے اوپر اُس کی چھاپ لے لی گئی تھی ـــ لڑکی کی اس یادگار کو اپنے سینے کے پاس

رکھ کر رحمت ہر سال کلکتہ کی سڑکوں پر میوہ فروخت کرنے آتا تھا۔ گویا اس نازک اندام معصوم بچی کے کومل ہاتھ کی چھاپ کا ٹکڑا اپنے اس کے ذریعے اس کے عظیم دو سینے میں امرت برساتا رہتا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس وقت میں بھول گیا کہ وہ شخص ایک کابلی میوہ فروش ہے اور میں ایک مہذب اور متمدن خاندانی بنگالی شخص ہوں۔ اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ جو وہ ہے وہی میں ہوں۔ وہ بھی باپ ہے اور میں بھی باپ ہوں ——— فلک بوس پہاڑیوں کی آغوش میں رہنے والی اس کی معصوم بچی کے ہاتھ کے نشان نے مجھے منی کی یاد دلادی۔ میں نے اسی وقت اسے آواز دے کر اندر سے بلا لیا۔ اس بارے میں اندر کئی قسم کے اعتراض کئے گئے لیکن میں نے جیسے کسی پر بھی کان نہیں دھرا۔ شادی کا لباس زیب تن کئے، پیشانی پر چندن لگائے دولہن بنی شرمائی، لجائی منی میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

اسے دیکھ کر کابلی والا پہلے تو سٹپٹا سا گیا۔ وہ پہلے کی طرح بات نہ کر سکا۔ بلکہ ہنس کر کہنے لگا۔

"بچی ——— ! تم سسرال جارہی ہو ——— ؟"

منی اب سسرال کا مطلب سمجھتی ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح جواب نہیں دے سکی۔ رحمت کے سوال کو سن، شرم و حیا سے سرخرو ہو کر منہ پھیر کر کھڑی رہی۔ کابلی والا کے ساتھ جس دن منی کی پہلی ملاقات ہوئی تھی وہ لمحہ مجھے یاد آگیا۔ دل ایک طرح تڑپ اٹھا۔

منی کے چلے جانے کے بعد رحمت ایک گہرا لمبا سانس لیتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔ شاید اب وہ یہ خوب سمجھ گیا تھا کہ اس کی لڑکی بھی اتنے لمبے عرصہ میں اسی طرح بڑی ہوگئی ہوگی ——— اس کے ساتھ بھی اب نئے

بات کرنی پڑے گی۔ اُسے بھی وہ اب ٹھیک پہلے جیسی نہیں پا سکے گا ——
ان آٹھ سالوں میں اُس کا کیا ہوا ہوگا۔ اُسے کون جانے —!

صبح کے وقت سردیوں کی نرم دھوپ کی چمکیلی کرنوں کے درمیان شہنائی بجنے لگی۔ رحمت کلکتہ کی ایک گلی کے اندر بیٹھا ہوا افغانستان کے ایک بنجر پہاڑ کا منظر دیکھنے لگا۔

میں نے ایک نوٹ لے کر اُسے دیا اور کہا۔

"رحمت! تم اپنے ملک میں اپنی لڑکی کے پاس لوٹ جاؤ۔ تم لوگوں کی پُر سکون ملاقات میں میری منی کا سکھ اور چین پوشیدہ ہے۔"

ان روپیوں کو دان کرنے کے بعد تقریب کے ایک دو پروگراموں کو کم کرنا پڑا۔ جس طرح سوچا تھا اُس طرح کی بڑی روشنی نہ ہو سکی — انگریزی باجے بھی نہیں آسکے۔ اندر گھر میں عورتیں میرے اطمینان کا اظہار کرنے لگیں ——
لیکن دلی آسودگی کی تمام تر رنگینیوں سے ہماری تقریب جگمگا اٹھی تھی۔

❁ ❁

پوسٹماسٹر

کام شروع کرتے ہی پوسٹماسٹر کو دولاپور گاؤں میں آنا پڑا۔ یہ گاؤں بہت سادہ ہے قریب ہی ایک نیل کی کوٹھی ہے۔ اس لئے کوٹھی کے صاحب نے انتہائی کوشش کرکے یہ نیا ڈاکخانہ کھلوایا ہے۔

ہمارے یہ پوسٹماسٹر کلکتہ کے رہنے والے ہیں۔ پانی کی مچھلی کو زمین پر لے جانے سے جو حالت ہوتی ہے۔ اس خالص دیہات میں آنے سے پوسٹماسٹر کی بھی ایسی ہی حالت ہوئی ہے۔ ایک اندھیرے ادھ پکے دار مکان میں ان کا آفس ہے۔ پاس ہی ایک پوکھری ہے اور اس کے چاروں طرف جنگل ہے۔ کوٹھی میں جتنے ملازم یا گماشتے ہیں اُن کو اکثر فرصت نہیں ملتی اور وہ لوگ بھلے آدمیوں کے ملنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔

خاص طور پر کلکتہ کا لڑکا اچھی طرح ملنا جلنا نہیں جانتا۔ غیر مانوس جگہ پر جانے پر یا تو اُداس ہو جاتا ہے یا گھبرا جاتا ہے۔ اس وجہ سے مقامی لوگوں سے اُس کا ملنا جلنا نہیں ہو پاتا۔ پھر یہی ہاتھوں کا کام زیادہ نہیں ہے۔ کبھی کبھی دو ایک نظمیں

لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ایسے جذبات پیدا کر لئے ہیں کہ سارا دن کلبلاتے ہوئے سرسبز و شاداب پتوں اور آسمان کے بادلوں کو دیکھ کر زندگی بڑے اطمینان سے کٹ جاتی ہے۔

پوسٹ ماسٹر کی تنخواہ نہایت مناسب ہے۔ خود رسوئی پکا کر کھانا پڑتا ہے اور گاؤں کی ایک یتیم لڑکی اُن کا کام کر دیتی ہے۔ اُسے کبھی دو چار روٹیاں ملجاتی ہیں۔ لڑکی کا نام ہے رتن۔ اُس کی عمر ۱۲۔۱۳ سال کی ہے۔ شادی ہونا بظاہر تو ممکن نظر نہیں آرہا۔

شام کے وقت جب گاؤں کے گھروں سے دھواں لہرا کر اُٹھنے لگتا ہے کونے کونے میں جھینگر بولنے لگتے۔ قدرے فاصلہ پر گاؤں کے نشہ باز۔ باؤل گویوں کا ہجوم ڈھول مجیرے بجا کر با آواز بلند گانا شروع کر دیتا۔ جس وقت اندھیرے چبوترے پر بیٹھ کر۔ اکیلا بیٹھ کر، جھومتے ہوئے درختوں کو دیکھ کر شاعر کے دل میں کبھی لرزش سی پیدا ہو جاتی تب گھر کے کونے میں ایک مدھم سی دیپک جلا کر پوسٹ ماسٹر کہا کرتے۔

"رتن ـــــ!"

رتن اس آواز کا دروازہ پر بیٹھی ہوئی انتظار کرتی رہتی۔ لیکن آواز سے ہی وہ گھر میں آتی۔ کہتی۔

"کیا ہے بابوجی! کیوں بلایا ہے ـــــ؟"

"تو کیا کر رہی ہے ـــــ؟" پوسٹ ماسٹر بولتے۔

تب رتن کہتی۔

"ابھی چولہا جلانا پڑے گا۔ رسوئی گھر کے ......"

پوسٹ ماسٹر بات کاٹ کر کہتے

"رسوئی گھر کا کام بعد میں ہوتا رہے گا۔ جا چلم تو چڑھا لا ۔۔۔"

تھوڑی ہی دیر میں دونوں گال پھلا کر چلم پر پھونک مارتی ہوئی رتن اندر آجاتی۔۔۔ ہاتھ سے چلم لے کر پوسٹ ماسٹر جھٹ پوچھ بیٹھتے۔

"اچھا رتن تجھے اپنی ماں کی یاد آتی ہے ۔۔۔؟"

قصہ لمبا ہے ۔۔۔ کچھ تو اس کو یاد آتی ہے۔ کچھ بھول گئی ہے۔ ماں کے مقابلہ میں باپ اس سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ باپ کی اسے کچھ کچھ یاد ہے۔ محنت مشقت کرکے باپ شام کو گھر لوٹ آتا تھا۔ ان میں سے ہی دو ایک شامیں اس کے دل میں منقش رہ گئی ہیں۔

اس طرح بات کرتے کرتے رتن پوسٹ ماسٹر کے پیروں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتی ۔۔۔ اسے یاد آتا اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ بہت دن کی بات ہے برسات میں ایک دن ایک معمولی پوکھر کے کنارے دونوں نے مل کر پیڑ کی ٹوٹی ہوئی ڈالی کی بنسی بنا کر جھوٹ موٹ مچھلی پکڑنے کا کھیل کھیلا تھا۔ بہت سے بڑے بڑے واقعات میں سے ایک یہی واقعہ اس کے دل میں جاگ اٹھتا تھا۔

اس طرح بات چیت ہوتے ہوتے کبھی کبھی بہت رات ہو جاتی۔ تب اکتاہٹ کی وجہ سے پوسٹ ماسٹر کا دل رسوئی بنانے کو نہ کرتا۔ سویرے کی بچی ہوئی باسی دال ترکاری مل جاتی اور جھٹ پٹ چولہا جلا کر رتن دو چار روٹیاں پکا لاتی۔

کسی کسی دن اُس اوسارے کے کونے میں آفس کی چوکی پر بیٹھ کر پوسٹ ماسٹر بھی اپنے گھر کی بات چھیڑ دیتے۔ چھوٹے بھائی کی، ماں کی اور بہن کی ۔۔۔ اور گھر میں تنہائی کے عالم میں بیٹھ کر جن کے لئے دل بیتاب ہو اٹھتا تھا ان کی باتیں کہتے ویسی باتیں جو حقیقت میں ان کے دل میں اُٹھتی رہتی ہیں، جو نیلی کوٹھی کے گماشتے سے کبھی کسی طرح نہیں کہی جا سکتیں۔ ایسی باتیں ایک غیر تعلیم یافتہ اور معمولی لڑکی سے کہتے

جاتے۔ اپنے دل میں وہ ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے۔ آخر میں ایسا ہوا کہ لڑکی بات چیت کرتے وقت اُن کے گھر والوں کو ماں، دیدی، بھیّا کہہ کر ایک نزدیکی واقف کار کی طرح اُن کا تذکرہ کرتی۔ یہاں تک کہ اپنے چھوٹے سے دل کے پردہ اُس لڑکی نے اُن کی تخیلی تصاویر بھی منقش کر لیں۔

ایک دن برسات کے دنوں میں بادلوں سے خالی دوپہر کو قدرے گرم لیکن سحر آفریں ہوا لہرا رہی تھی۔ دھوپ لگنے سے نم آلود گھاس اور پیڑ پودوں سے ایک طرح کی وحدہ آور بو نکل رہی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ گویا تھکی ہوئی زمین کی گرم سانس جسم کے اوپر محسوس ہو رہی ہے ــــ اور نجانے کہاں کی ایک ضدی چڑیا...

...... لگاتار چلنے والے سُر سے اپنی شکایات قدرت کے دربار میں انتہائی اندوہناک سُر سے بار بار سُنا رہی تھی ــــــ پوسٹ ماسٹر کے ہاتھ میں کوئی کام نہیں تھا۔ اُس دن بارش سے دھلے، چکنے، نازک پتوں کے ہلورے آسمان پر منڈلاتے ہوئے بادل سچ مچ دیکھنے کے قابل تھے۔ پوسٹ ماسٹر اُنہیں ہی دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے ــــ اس وقت اپنے پاس کوئی دل کی دھڑکن سننے والا کوئی پیار اور پریم کی مورتی ہوتی۔ آہستہ آہستہ معلوم ہونے لگا کہ وہ چڑیا ایک ہی بات بار بار کہہ رہی ہے اور ان اُداس درختوں کی چھایا میں ڈوبی ہوئی پُرسکون دوپہر کا مطلب بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ کوئی وشواس بھی نہیں کرتا۔ جان بھی نہیں سکتا۔ لیکن چھوٹے سے گاؤں کے معمولی سی تنخواہ والے پوسٹ ماسٹر کے دل میں اس گہری خاموش دوپہر میں چھٹی کے دن ایسے ہی جذبات موجزن رہتے۔

پوسٹ ماسٹر نے ایک لمبی سانس چھوڑ کر پکارا

"رتن ــــ!"

رتن اُس وقت ... کے نیچے ... بیٹھی کچا امرود کھا رہی تھی۔

مالک کی آواز سُن کر وہ دوڑتی ہوئی آئی۔ ہانپتی ہوئی بولی۔

"بھیا جی! مجھے بلا رہے تھے ۔۔۔؟"

"تجھے میں کچھ پڑھنا سکھاؤں گا ۔۔۔" پوسٹ ماسٹر نے کہا۔

یہ کہہ کر اُس دن دوپہر بھر ابتدائی حروف ابجد سکھاتے رہے اور اس طرح وہ تھوڑے ہی دنوں میں اچھا خاصہ پڑھنا سیکھ گئی۔

ساون کا مہینہ ہے، بارش کی کوئی حد نہیں۔ نہر، جھیل، تالاب، نالے پانی سے بھر گئے ہیں، دن رات مینڈکوں کی بولی اور بارش کی جھڑی کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ گاؤں کے راستوں سے لوگوں کا چلنا پھرنا ایک طرح سے بند ہو گیا ہے ۔۔۔ ناؤ پر بیٹھ کر بازار جانا پڑتا ہے۔

ایک دن صبح سے ہی خوب بادل چھائے ہوئے تھے۔ پوسٹ ماسٹر کی طالبہ بہت دیر سے دروازے کے پاس انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن دیگر دنوں کی طرح مخصوص آواز نہ سُن کر خود ہی کاپی کتابیں اُٹھا کر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی کمرے کے اندر چلی گئی۔ اُس نے دیکھا پوسٹ ماسٹر کھاٹ پر سوئے ہوئے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ وہ آرام کر رہے ہیں وہ چپ چاپ کمرے سے باہر جانے کو تیار ہو گئی۔ یکبارگی اُس نے سنا۔

"رتن ۔۔۔!"

"بھیا جی ۔۔۔! تم سو رہے تھے نا!" جھٹ پٹ لوٹ کر وہ بولی۔

پوسٹ ماسٹر نے کربناک آواز میں کہا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی رتن ۔۔۔! دیکھ تو میری پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر ۔۔۔!"

اس تنہائی کے عالم میں، موسلا دھار بارش کے وقت علیل جسم کو قدرے تیمار داری کی ضرورت ہوتی ہے۔ تپتی ہوئی پیشانی پر چوڑیوں والے نرم و نازک ہاتھ کا

اُس یاد آ ہی جاتا ہے ۔ اس تنہائی کے عالم میں تکلیف کی شدت کو محسوس کرتے وقت ہمدرد اور غمخوار عورت کی شکل میں ماں اور بہن پاس بیٹھی ہیں یہ بات سوچنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے ۔ اور یہاں مریض کی دلی خواہش رائیگاں نہیں گئی ۔ بیٹی اب بچی نہیں رہی ۔۔۔ اُسی وقت اُس نے جننی کا رتبہ حاصل کر لیا ۔ وہ وید کو بلا لائی ۔ ٹھیک وقت پر اُس نے دوا کھلادی ۔ ساری رات سرہانے بیٹھی جاگتی رہی ۔ خود ہی دودھ ابال لائی اور سو سو بار پوچھتی رہی ۔

" بھیّا جی ! کچھ آرام معلوم پڑ رہا ہے ۔۔۔؟"

بہت دنوں کے بعد پوسٹ ماسٹر کمزور و ناتواں جسم لیکر بستر علالت سے اُٹھے ۔ دل میں انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب یہاں نہیں رہنا ۔ یہاں سے کسی نہ کسی طرح تبادلہ کرانا ہی ہے ۔ یہ جگہ اُن کی صحت کے موافق نہیں ہے ۔۔۔ انہی تکلیفات کا حوالہ دے کر انہوں نے کلکتہ کے افسران بالا کے پاس درخواست بھیجدی ۔

مریض کی خدمات سے فراغت پا کر رتن نے دروازے کے باہر اپنی جگہ پر قبضہ کر لیا لیکن پہلے کی طرح آواز دے کر اب اُسے بلایا نہیں جاتا ۔ بیچ بیچ میں وہ جھانک کر دیکھتی ۔۔۔ پوسٹ ماسٹر بڑے پریشان سے چپ کے بیٹھے ہیں یا ۔۔۔ یا کھاٹ پر سوئے ہوئے ہیں ۔ رتن جب آواز پڑنے کے انتظار میں باہر بیٹھی رہتی تو وہ بڑی بے قراری سے اپنی درخواست کا انتظار کرتے رہتے ۔ لڑکی نے دروازہ کے باہر بیٹھ کر کوئی ہزار مرتبہ اپنا سبق پڑھ ڈالا ۔ اُس کا یہ شک قائم رہا کہ کسی بھی وقت اچانک آواز آنے پر کہیں وہ اپنا سبق سنانے میں گڑبڑا نہ جائے ۔

بالآخر ایک ہفتہ کے بعد ایک شام اُسے بلایا گیا ۔ گھبراہٹ بھرے دل کے ساتھ رتن اندر چلی گئی اور بولی ۔

"بھیا جی! مجھے بگاڑ رہے تھے ——؟"

"رتن میں کل ہی جا رہا ہوں ——!" پوسٹ ماسٹر نے کہا۔

"کہاں جا رہے ہو بھیا جی؟"

"گھر جا رہا ہوں ——!"

"پھر کب آؤ گے؟"

"اب نہیں آؤں گا ——!"

رتن نے پھر کوئی بات نہیں پوچھی۔

پوسٹ ماسٹر نے خود ہی اُس سے کہا۔ اُنہوں نے تبادلہ کیلئے درخواست بھیجی تھی۔ وہ درخواست نامنظور ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ کام سے استعفیٰ دیکر گھر جا رہے ہیں۔

بہت دیر تک کسی نے بھی کوئی بات نہیں کہی۔ دیا ٹمٹماتا ہوا جل رہا تھا —— کچھ دیر بعد رتن دھیرے دھیرے اُٹھ کر رسوئی گھر میں روٹی بنانے چلی گئی۔ اور دنوں کی طرح جھٹ پٹ رسوئی تیار نہیں ہوئی۔ رہ رہ کر اُس کے دل میں مختلف قسم کی باتیں منڈلا رہی تھیں۔

پوسٹ ماسٹر جب کھانا کھا چکے تو لڑکی نے اچانک ہی اُن سے پوچھا۔

"بھیا جی! تم اپنے گھر مجھے لے چلو گے؟"

"یہ کیسے ہوگا ——؟" پوسٹ ماسٹر نے ہنس کر کہا۔

وہ بات کیا ہے ——! کس وجہ سے ناممکن ہے یہ معصوم لڑکی کو سمجھانا اُنہوں نے ضروری نہ سمجھا۔

ساری رات نیند میں اور خواب میں لڑکی کے کانوں میں پوسٹ ماسٹر کی مسکراہٹ بھری وہی آواز گونج رہی۔

"یہ کیسے ہوگا ۔۔۔ ؟"

صبح اُٹھ کر پوسٹ ماسٹر نے دیکھا۔ اُن کے نہانے کا پانی تیار رکھا ہوا ہے۔ کلکتہ کی عادت کی وجہ سے وہ گھڑ کر لائے ہوئے پانی سے غسل کرتے تھے۔ کسی وجہ سے لڑکی اُن سے یہ نہ پوچھ سکی کہ وہ کب جائیں گے۔ کہیں علی الصبح ہی ضرورت نہ پڑ جائے اس لئے رتن رات رہتے ہی اُن کے نہانے کے لئے پانی گھڑ لائی تھی۔ غسل کے بعد رتن کو آواز دی گئی۔ رتن چُپ چاپ گھر چلی گئی۔ اور ہدایات حاصل کرنے کے خیال سے اُس نے ایک بار مالک کے منہ کی طرف دیکھا۔

مالک نے کہا۔

"رتن ۔۔۔ ! میری جگہ پر جو شخص آئے گا اُن سے میں کہہ جاؤں گا کہ وہ میری ہی طرح بڑے لاڈ سے تجھے رکھیں گے ۔۔ میں جا رہا ہوں تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ باتیں سنجیدہ اُنس دمحبت سے اور ہمدرد دل سے نکلی تھیں۔ لیکن عورت کے دل کو کون جانے گا ۔۔۔ رتن بارہا مرتبہ مالک سے مختلف قسم کی ڈانٹ پھٹکار سُن چکی ہے۔ لیکن اس نرم بات کو وہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ یکبارگی بھرے ہوئے دل سے رو کر بولی۔

"نہیں نہیں ۔۔۔ کسی سے تم کچھ بھی مت کہنا ۔۔ میں رہنا نہیں چاہتی ۔۔!!"

پوسٹ ماسٹر نے رتن کا ایسا سلوک کبھی بھی نہیں دیکھا۔ اس وجہ سے خاموش کھڑے رہے۔

نیا پوسٹ ماسٹر آیا۔ اُس کو پورا چارج سمجھا کر پُرانے پوسٹ ماسٹر جانے کو تیار ہو گئے۔ جاتے وقت اُنہوں نے رتن کو بلا کر کہا۔

"رتن ۔۔۔ ! تجھے کبھی میں کچھ بھی نہ دے سکا آج جاتے وقت

تجھے کچھ دیئے جاتا ہوں۔ اس سے کچھ دن تمہارا کام چلے گا۔!!"

راہ خرچ کے کچھ روپے الگ کر کے تنخواہ کے جو روپے بچے تھے اُنہیں اُنہوں نے جیب سے نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیئے۔

تب رتن نے زمین میں لوٹ کر اُن کے پیر پکڑ کر کہا۔

بھیا جی! تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ تمہارے دونوں پیر پکڑتی ہوں مجھے کچھ بھی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ میرے لئے کسی کو کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ ایک ہی دوڑ سے وہاں سے بھاگ گئی۔

پرانے پوسٹ ماسٹر ایک لمبا سانس لیکر ہاتھ میں کارپیٹ کا بیگ لٹکائے کندھے پر چھاتہ رکھے، مزدور کے سر پر نیلے اور سفید رنگ کی لکیروں سے سجا ہوا پٹارہ ٹین کا لاد کر آہستہ آہستہ کشتی کی طرف چلدیئے۔ جب وہ کشتی پر چڑھ گئے۔ اور کشتی چلنے لگی۔ بارش سے پھیلی ہوئی ندی جب چاروں طرف چھل چھل کرنے لگی تو وہ دل کے اندر ایک ٹیس سی محسوس کرنے لگے۔ ایک سیدھی سادی معصوم شکل دیہاتی لڑکی کی اداس شکل گویا اُن کے دل میں سیدھے نگاہ رہی تھی۔ ایک بار تو دل میں خیال پیدا ہوا کہ لوٹ چلیں۔ سنسار کی گود سے بچھڑی ہوئی اس یتیم لڑکی کو اپنے ساتھ لیتے چلیں۔ لیکن اس وقت تک کشتی کافی دور نکل آئی تھی۔ بارش بھی تیزی سے ہونے لگی تھی۔ گاؤں کو پار کر کے ندی کے کنارے کا شمشان دکھائی دینے لگا تھا۔ اور ندی کی روانی میں بہتے ہوئے مسافر کا اداس دل اس حقیقت سے روشناس ہو گیا کہ زندگی میں ایسے کتنے ہی فراق اور کتنی ہی موتیں ہیں ۔۔۔۔ لوٹنے سے کیا حاصل؟ دنیا میں کون

کس کا ہے۔

لیکن رتن کے دل میں کوئی بھی حقیقت اجاگر نہ ہوئی۔ وہ اس پوسٹ آفس کے چاروں طرف صرف آنسو بہاتی ہوئی گھوم رہی تھی۔ شاید اُس کے دل میں ہلکی سی ایک اُمید کی کرن جگمگا رہی تھی۔ شاید بھیا جی لوٹ آئیں ـــــ اس بندھن میں پڑ کر کسی طرح بھی وہ دور نہیں جا سکتی تھی ـــــ اُف ـــــ بیوقوف اور نادان انسانی دل ـــــ تیرا وہم کسی طور بھی ختم نہیں ہوتا ـــــ حقیقتِ حال سے تو بہت دیر بعد روشناس ہوتا ہے ـــــ اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی تو اُمید کی موہوم سی کرن کو اپنے سینے میں دبائے پھرتا ہے ـــــ لیکن آخیر میں ایک دن جسم کی تمام تر شریانوں کو کاٹ کر دل کا خون چوس کر وہ بھاگ جاتی ہے ـــــ تب ہوش آتا ہے۔ اور کسی دوسرے وہم کو اپنی گرفت میں لینے کیلئے دل بیتاب ہو اُٹھتا ہے ـــــ !!

●●

لین دین

پانچ لڑکوں کے بعد جب ایک لڑکی پیدا ہوئی تو ماں باپ نے بڑے ہی چاؤ سے اس کا نام رکھا ــ نرو پا ـــــ !! اس خاندان میں اتنا خوبصورت نام کبھی پہلے نہیں سنا گیا تھا۔ اکثر دیوی دیوتاؤں کے نام ہی رکھے جاتے تھے مثلاً گنیش ۔ کارتکیہ ۔ پاروتی ۔

اب نروپا کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اُس کے پتا نے انتہائی کوشش اور تلاش کی۔ لیکن من پسند لڑکا نہیں ملا۔ بالآخر ایک بڑے رائے بہادر کے اکلوتے لڑکے کو انہوں نے ڈھونڈھ نکالا۔ مذکورہ رائے بہادر کی جاگیر اور جائیداد اب اگرچہ پہلے کے مقابلہ میں بہت گھٹ گئی ہے اس کے باوجود پرانا مشہور گھرانا تو ہے ہی۔

لڑکے والوں نے دس ہزار روپے تلک جہیز میں اور اس کے علاوہ اور بہت سی اشیاء شادی میں مانگی ہیں۔ رام سندر نے اتنا سا بھی غور و خوض نہ کیا اور ان کی ہر شرط قبول کر لی۔ اس گھر کو کسی طرح بھی ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا جا سکتا

کسی طرح بھی روپے کا انتظام نہ کیا جا سکا۔ گروی رکھ کر جائیداد فروخت کرنے کے بعد بھی تقریباً چھ سات ہزار کی کمی رہ گئی۔ اُدھر شادی کا دن نزدیک ...... آ گیا۔

آخر شادی کا دن آ ہی گیا۔ بہت زیادہ اور کسی حد تک ناجائز سود پر ایک شخص نے روپے اُدھار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ایک عین وقت پر وہ حاضر نہ ہو سکا۔ شادی کے منڈپ میں کہرام مچ گیا۔ رام سند نے رائے بہادر کے ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"پہلے یہ مبارک رسم ختم ہو جانے دیں پھر میں یقیناً باقی ماندہ روپے ادا کر دوں گا ۔۔۔!!"

رائے بہادر نے کہا۔

"روپیہ جب تک میرے ہاتھ میں نہیں آ جاتا اُس وقت تک لڑکے کو وِواہ منڈپ میں نہ بھیجا جائے گا ۔۔۔!!"

اس حادثہ کی خبر پاتے ہی اندر گھر میں رونا دھونا شروع ہو گیا۔ اس ناقابل برداشت آفت کو لانے کی جو اصل وجہ تھی وہ شادی کا لکش لباس زیب تن کیے۔ طلائی زیورات پہنے۔ پیشانی پر چندن کا ٹیکہ لگائے بیٹھی تھی ہونے والی سسرال کے تئیں اُس کے دل میں ہمدردی یا محبت کا جذبہ جاگ رہا تھا۔ ایسی تو کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

اس بیچ ایک آسانی ہو گئی۔ اچانک ہی دولہا اپنے پتا کے خلاف ہو گیا کہنے لگا۔

"خرید و فروخت ۔ سودہ بازی کی باتیں میں نہیں جانتا۔ شادی کرنے کیلئے یہاں آیا ہوں شادی کر کے ہی جاؤں گا ۔۔۔!!"

پتا نے جس کی طرف دیکھا اُس نے ہی کہا۔

"دیکھ رہے ہو مہاشہ جی! آج کے لڑکوں کا سلوک ۔۔۔!"

لیکن اپنے لڑکے کی ضد کے آگے رام سہائے کی ایک نہ چلی۔ شادی ایک طرح سے انتہائی پُرسکون ماحول میں بخیر و خوبی انجام پائی۔

مرد وسیا سسرال جانے لگی تو اُسے اپنی چھاتی سے لگا کر پتا اپنے آنسو نہ روک سکے۔ مرد وسیا نے پوچھا۔

"وہ لوگ کیا مجھے یہاں پھر نہیں آنے دیں گے باپو جی ۔۔۔؟"

"کیوں نہیں آنے دیں گے بیٹی ۔۔۔! میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔"

رام سندر نے کہا۔

•

رام سندر اکثر لڑکی کو دیکھنے کے لئے جاتے ہیں۔ لیکن سمدھی کے گھر اُن کی کوئی عزت نہیں ہے ۔۔۔ نوکر چاکر بھی اُنہیں حقارت بھری نظروں سے دیکھتے اندر گھر کے ایک علیحدہ کمرے میں پانچ منٹ کے لئے وہ کسی دن لڑکی کو دیکھ پاتے ہیں۔ کسی دن تو ملاقات ہی نہیں ہوتی۔

اپنے رشتہ دار کے گھر اس قدر بے عزتی تو اب برداشت نہیں کی جاتی ۔۔۔

رام سندر نے تہیہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو روپیہ ادا کرنا چاہیئے۔

لیکن قرض کا بوجھ تو اوپر لدا ہوا ہے ۔۔۔ اس قرض کا بوجھ برداشت کرنا ہی مشکل ہو رہا ہے۔ اخراجات الگ بڑھے ہوئے ہیں۔ مہاجنوں کی نظروں سے بچنے کیلئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچتی رہتی ہیں۔

اُدھر سسرال میں ۔۔۔۔ اُٹھتے بیٹھتے لڑکی کو طعن و تشنیع سے نوازا جاتا ۔۔۔ پتا کے گھر کی بُرائی سُن کر گھر سے کا دروازہ بند کر کے آنسو بہانا اُس کا معمول ہو گیا۔

خاص طور پر ساس کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا ۔۔۔ اگر کوئی کہتا "آہاہا ۔۔۔ کیا حُسن ہے ۔۔۔! بہو کا مُنہ دیکھنے سے آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں ۔۔۔" سُنتے ہی ساس جھڑک کر کہتی ۔۔۔ "بڑی حسین ہے ۔۔۔! ارے جیسے گھر کی لڑکی ہے، اتنی ہی خوبصورت بھی ہے ۔۔۔!"

یہاں تک کہ بہو کے کھانے پینے کی فکر بھی کسی کو نہیں رہتی ۔ اگر ہم دردِ دل یا پڑوسن کسی خامی کا تذکرہ کرتی تو ساس کہتی ۔۔۔ "یہی اس کے لئے بہت ہے" یعنی اگر اس کے باپ نے پورے روپے ادا کئے ہوتے تو وہ بھی پوری عزت پاتی ۔۔۔ سبھی اس طرح کا سلوک روا رکھتے گویا دُلہن کا اس گھر پر کوئی حق نہیں ہے ۔۔۔ دھوکہ دے کر اس گھر میں چلی آئی ہے ۔۔۔!

اگرچہ لڑکی کی اس قدر بے عزتی اور تحقیر کی بات پتا کے کانوں میں پہنچ چکی تھی ۔ اسی وجہ سے رام سندر آخر میں اپنا مکان فروخت کرنے کی فکر کرنے لگے ۔ لیکن لڑکوں کو لئے گھر بار کرنے کو تیار ہو گئے ہیں ۔ اس بات کو اُنہوں نے چھپا لیا جس کو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مکان کو فروخت کر کے پھر اسی مکان کو کرایہ پر لے کر رہیں گے ۔ اس ترکیب سے وہ یہ کر لیں گے کہ اُن کی موت سے قبل یہ بات لڑکے جان ہی سکیں گے ۔

لیکن لڑکے جان گئے ۔ سبھی رونے لگے ۔ آگر ۔۔۔ خاص طور پر بڑے تینوں لڑکے تھے جو شادی شدہ تھے گھبرا گئے ۔ اُن میں سے کسی کسی کے بال بچے بھی تھے ۔ اُن کے اعتراض نے انتہائی نازک صورتِ حال پیدا کر دی تھی ۔۔۔ مکان فروخت نہ ہو سکا ۔

تب رام سندر کرتے تو مختلف جگہوں سے تھوڑا تھوڑا قرض لینے لگے ۔ ایسی حالت ہو گئی کہ گھر کا خرچ بھی نہیں چلتا تھا ۔

نرنجا پتا کا چہرہ دیکھ کر سب سمجھ گئی۔ مگر پتا کے پکے ہوئے بالوں سے خشک چہرے سے اور انتہائی قابل رحم حالت دیکھ کر اُن سے ہمدردی ہونے لگی۔ جب پتا لڑکی کے تئیں قصوروار ہو تو اس قصور کو کہاں چھپایا جا سکتا ہے؟ رام سندر جب سمدھی کے گھر سے اجازت ملنے پر تھوڑی دیر کیلئے لڑکی سے ملاقات کرتے تھے تو اُن کی چھاتی کس طرح پھٹنے لگتی تھی اُن کا چہرہ دیکھنے سے ہی اس کا پتہ لگ جاتا تھا۔

اس ٹوٹے ہوئے دل کو دلاسہ دلانے کے خیال سے کچھ دنوں کیلئے پتا کے گھر جانے کے واسطے نرنجا انتہائی بے تاب ہو گئی۔ پتا کا مرجھایا ہوا اور اُداس چہرہ دیکھ کر وہ اب دور نہیں رہ سکتی۔ ایک دن اُس نے رام سندر سے کہا۔

"باپوجی ۔۔۔ اب مجھے گھر لے چلو ۔۔۔!!"

رام سندر نے کہا۔

"اچھا ۔۔۔!!"

لیکن اس کام میں اُن کا زور نہیں تھا۔ اپنی لڑکی کے اوپر پتا کا جو ممکن حق قائم رہتا ہے اُسے گویا جہیز کے روپیے کے بدلے گروی رکھ دینا پڑا ہے ۔۔۔ یہاں تک کہ لڑکی سے ملاقات کرنے کیلئے بھی انتہائی ہچکچاہٹ کے بعد کہنا پڑتا ہے اور کسی خاص موقع پر نا اُمید ہو جانے پر پھر دوسری بات کہنے کو مُنہ نہیں رہتا۔

لیکن لڑکی خود اپنے پتا کے گھر آنا چاہے تو پتا اُسے لائے بغیر کیسے رہ سکتا ہے اس وجہ سے سمدھی کے سامنے اس بارے میں درخواست داخل کرنے سے پہلے رام سندر نے کسی قدر تحقیر، کتنی بے عزتی برداشت کر کے کتنی پریشانیوں

سے لیکن [illegible] جہیز کے لئے ... نے اس بات کو اشد [illegible] مناسب ہے

ان کئی نوٹوں کو رومال میں باندھ کر رام سندر سمدھی کے پاس آئے۔ پہلے ہنستے ہوئے چہرے سے اُنہوں نے گاؤں محلے کا تذکرہ چھیڑا۔ ہری کرشن کے مکان میں ایک بہت بڑی چکی ہے۔ اُس کا ابتدا سے آخیر تک حال سُنایا۔ نوین مادھو اور رادھا مادھو دو بھائیوں کا مقابلہ کر کے اُن کی تعلیم و تربیت۔ اُن کی قابلیت اور اُن کے مزاج و کردار کے بارے میں رادھا مادھو کی تعریف اور نوین مادھو کی بُرائی کی۔ شہر میں ایک عجیب و غریب بیماری پھیل گئی ہے۔ اُس کے بارے میں مختلف من گھڑت قصے بیان گئے۔ آخیر میں حقہ ایک طرف رکھ کر بات ہی بات میں اُنہوں نے کہا۔

" ہاں ہاں سمدھی جی! وہ روپے ابھی باقی ہی ہیں ـــــ روزانہ ہی سوچتا ہوں جاؤں اور کچھ لیتا جاؤں لیکن عین وقت پر خیال ہی نہیں رہتا۔ اور بھائی اب تو میں بوڑھا ہو چلا ہوں ــــ " ایسی ہی ایک تمہید باندھ کر پنجروں کی تین ہڈیوں کی طرح ان تینوں نوٹوں کو گویا بہت لاپروائی سے نکال کر اُن کے سامنے رکھ دیا ـــــ

صرف تین ہزار کے نوٹ دیکھ کر دائیے بہادر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے

اُنہوں نے کہا۔

" رہنے دیں سمدھی جی ـــــ! اُن کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ـــــ "

ایک مروجہ کہاوت کا حوالہ دے کر کہا ـــــــــ اُکا دیکھے وہ اپنے ہاتھ میں بدبو پھیلانا نہیں چاہتے ـــ

اس کے بعد لڑکی کو گھر پہونچانے کی تجویز کسی کے منہ سے نہیں نکلی ـــــــ

صرف رام سندر نے ہی سوچا، رشتہ داری کے بندھن اور یہ ہچکچاہٹ اب مجھے زیب نہیں دیتی۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ وہ بڑی دیر تک خاموش کھڑے رہے آخیر میں لڑکی کو وداع کرانے کی تجویز اُنہوں نے نہایت نرم و لطیف لہجہ میں پیش کر دی۔

رائے بہادر نے کسی بھی وجہ کو ظاہر کئے بغیر ہی کہا۔

"یہ کام ابھی ہونے والا نہیں ہے —!"

یہ کہہ کر رائے بہادر کسی کام کے بہلانے اُٹھ کر اندر چلے گئے۔

رام سندر لڑکی کو منہ نہ دکھا کر لرزتے ہوئے ہاتھ سے نوٹ چادر کے کونہ میں باندھ کر گھر لوٹ گئے۔ دل ہی دل میں انہوں نے عہد کر لیا کہ جب تک پورا روپیہ ادا کر کے بلا ہچکچاہٹ لڑکی کے اوپر اپنا دعویٰ نہ رکھ سکیں گے۔ اُس وقت تک سمدھی کے گھر نہ جائیں گے۔

•

ایک عرصہ گذر گیا۔ نروپما آدمی پر آدمی بھیجتی رہتی۔ لیکن پتا ملاقات کرنے نہ جاتے آخر غصہ میں آکر اُس نے آدمی بھیجنا بند کر دیا۔ تب رام سندر کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا۔ لیکن وہ گئے نہیں۔

اگست کا مہینہ آ گیا۔ رام سندر بولے :

"اس بار پوجا کے وقت بیٹی کو گھر لانا ہی پڑے گا —— نہیں تو میں....."

اُنہوں نے کوئی زبردست حلف اُٹھا لیا —!

پنچمی یا چھٹی کے دن پھر اپنی چادر کے کونے میں کچھ نوٹ باندھ کر ..... عازم سفر ہوئے۔ پانچ سال کے ایک بچے نے کہا۔

"بابا — تم میرے لئے گاڑی خریدنے جا رہے ہو —؟"

بہت دنوں سے اس کو ٹھیلہ گاڑی پر چڑھ کر ہوا کھانے کا شوق ہو گیا ہے — کسی طرح بھی اس شوق کے پورا ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

پھر چھ سال کے ایک بچّے نے آکر کہا — "پوجا کی تقاریب دیکھنے کیلئے اس کے پاس ایک بھی نیا کپڑا نہیں ہے —"

رام سندر یہ بات جانتے تھے اور تمنا کو پیتے پیتے اس موضوع پر بہت کچھ سوچ چکے تھے۔ رائے بہادر کے گھر سے جب پوجا کے وقت دعوت نامہ آئیگا تو اُن کے گھر کی بہوؤں کو نہایت معمولی زیورات کے ساتھ حقیر بن کر جانا پڑے گا۔ یہ بات یاد کر کے وہ بار بار تڑپ کر ٹھنڈا سانس چھوڑ چکے ہیں۔ لیکن اس سے اُن کے بڑھاپے کی لکیریں اور زیادہ گہری ہونے کے علاوہ کوئی فرق نہ پڑا۔ انتہائی دُکھ کے ساتھ آج وہ اپنے سمدھی کے گھر میں داخل ہوئے۔ آج اُن کے دل میں پہلے کی سی ہچکچاہٹ کے جذبات نہیں تھے۔ دربانوں اور نوکروں چاکروں کے تئیں استعجاب اور حیرت میں ڈوبی ہوئی نگاہیں آج کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں۔ گویا وہ آج اپنے ہی گھر میں داخل ہو رہے ہوں ۔۔۔ وہاں اُنہیں پتہ چلا کہ رائے بہادر گھر پر نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ اپنے دلی جذبات پر قابو پانے کیلئے رام سندر نے لڑکی سے ملاقات کی۔ خوشی اور مسرت کے ملے جلے آنسو اُن کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ پتا بھی رو رہے تھے اور لڑکی بھی رو رہی تھی۔ شدت جذبات کی وجہ سے کوئی بھی دونوں میں سے ایک لفظ نہ بول سکا۔ اس کے بعد رام سندر نے کہا۔

"اس بار میں تجھے لے چلوں گا بیٹی ۔۔۔! اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔!"

اُسی وقت رام موہن کا بڑا لڑکا ہر موہن اپنے دونوں چھوٹے لڑکوں کو ساتھ لے کر اچانک ہی کمرے میں داخل ہوا۔ پتا سے اُس نے کہا۔

"بابوجی ۔۔۔! آپ نے تو ہمیں راستے ہی میں چھوڑ دیا ۔۔۔!"

رام سندر نے فوراً ہی آگ بگولہ ہو کر کہا۔

"تم لوگوں کیلئے کیا میں رُک جاؤں گا ۔۔۔ مجھے تم لوگ اپنے عہد کو پورا نہ کرنے دو گے ۔۔۔؟"

رام سندر اپنا مکان فروخت کر کے آئے تھے۔ وہ اس کا انتظام کر آئے تھے

کہ لڑکے یہ بات کسی طرح نہ جان سکیں۔ لیکن پھر بھی وہ لوگ جان گئے ہیں۔ یہ سمجھ کر وہ ان لوگوں سے بہت زیادہ ناراض اور خفا ہو گئے۔

اُن کے پوتے ان نے اپنے دونوں گھٹنوں کو زور سے پکڑ کر منہ اٹھا کر کہا۔

"بابا! میرے لئے تم نے گاڑی نہیں خریدی — !"

سر جھکائے رام سندر بیٹھے رہے۔ اُس نے اُن سے کوئی جواب نہ پاکر نیرو کے پاس جاکر کہا۔

"نواجی! تم مجھے ایک گاڑی خرید دوگی — ؟"

نروپما ساری بات سمجھ گئی۔ اور بولی۔

"بابوجی! اگر تم نے ایک بھی پیسہ میرے سسر کو دیا تو مجھے زندہ نہ دیکھ سکوگے میں یہ بات تمہارا سر چھو کر کہہ رہی ہوں —"

"چھی — ! بیٹی ایسی بات نہیں کہنی چاہئے۔ اور اگر میں یہ روپیہ نہ دے سکوں گا تو اس سے تیرے باپ کا اپمان ہوگا اور تیرا بھی اپمان ہوگا —"

"اگر روپیہ دوگے تو بھی اپمان ہوگا —" نرو نے کہا — "تمہاری لڑکی کی کیا کوئی عزت نہیں ہے؟ میں کیا صرف روپے کی تھیلی ہوں، جب تک روپے ہیں اُسی وقت تک میری قدر و قیمت ہے — ؟ نہیں بابوجی! یہ روپیہ دے کر تم میرا اپمان نہ کرو۔ اس کے علاوہ میرے پتی کو تو ان روپوں کی خواہش نہیں ہے"

"ایسا کرنے سے یہ لوگ تمہیں جانے نہ دیں گے بیٹی — !!" رام سندر نے کہا۔

"نہ جانے دیں گے تو کیا کر دوگے، بتاؤ — ! تم بھی اب مجھے مت لے جانا چاہو —" نروپما نے کہا۔

رام سندر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چادر کاندھے پہ رکھ کر پھر چور وں

کی طرح سب کی نظروں سے بچ کر گھر لوٹ گئے۔

رام سندر روپے لے آئے تھے اور محض لڑکی کے کہنے سے نہ دیکھ ہی چلے گئے تھے۔ یہ بات چھپی نہ رہی۔ دروازے کے پاس کھڑی ہو کر ایک چغل خور نوکرانی نے باپ بیٹی کی یہ گفتگو سُن لی تھی اور اُس نے ہی ساس کے پاس جا کر یہ خبر سُنائی تھی۔ یہ سُن کر ساس کے غصہ اور قہر کی کوئی حد نہ رہی۔

نروپما کیلئے سُسرال جہنم زار بن گیا۔ ادھر اُس کے پتی شادی کے تھوڑے ہی دن بعد ڈپٹی مجسٹریٹ ہو کر کسی دوسرے شہر میں چلے گئے تھے۔ پڑوسنوں اور اور سہیلیوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ کر یہ اور بھی بُری باتیں سیکھ سکتی ہے اسی لئے میکے والوں نے نروپما پر کسی کے ساتھ ملنے جلنے کی پابندی لگا دی تھی۔

انہی دنوں نروپما کو کسی خوفناک بیماری نے گھیر لیا۔ لیکن اس کیلئے اُس کی ساس کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ وہ اپنے جسم کے تئیں ضرورت سے زیادہ لاپرواہی برتتی تھی۔ جنوری فروری کے مہینے میں ساری رات سردی کے وقت سرہانے کی کھڑکی کھلی رہتی تھی۔ کھانے پینے میں کوئی احتیاط نہیں برتتی تھی۔ نوکرانی اگر کبھی کھانا بھول جاتی تھی تو وہ دبے الفاظ میں ایک بار بھی اس بات کا تذکرہ نہیں کرتی تھی۔ وہ پرائے گھر میں ایک خادمہ کی مانند ہے۔ اور بیگانے گھر کے مالک اور مالکن کی مہربانی اور منظرِ عنایت پر اُس کی خوشیاں منحصر ہیں۔ یہی بات اُس کے دل میں جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کا یہ برتاؤ بھی ساس کو برداشت نہ ہو سکا۔ کھانے پینے میں بہو کی لاپرواہی کو دیکھ کر ساس اکثر کہتی ـــ

"نواب کے گھر کی لڑکی ہے نا ـــ! غریب کے گھر کا ان اُس کے منہ کو اچھا ہی نہیں لگتا ـــ"

اور کبھی کہتی:

" دیکھونا! یہ کتنی خوبصورت ہوتی جارہی ہے۔ روز بروز اُس کی صحت ککڑی کی طرح ہوتی جارہی ہے ۔"

بیماری نے جب خوفناک شکل اختیار کرلی تو ساس نے کہا۔

" یہ سب اس کا ڈھونگ ہے ۔"

بالآخر ایک دن نیرو نے غمگین، اُداس لہجہ میں اپنی ساس سے کہا ۔

" بابوجی کو، اور اپنی ماں کو دیکھنے کو دل کررہا ہے ماں ۔ !"

" یہ صرف میکے جانے کا بہانہ ہے اور کچھ نہیں ۔" ساس نے کہا۔

کسی کو اس کہنے پر یقین نہ ہوگا ۔ جس دن شام کے وقت نیرو کا سانس اُکھڑنے لگا اُس دن پہلی بار ڈاکٹر اُسے دیکھنے آیا۔ اور اُسی دن ڈاکٹر نے آخری بار دیکھا گھر کی بڑی بہو مرگئی ۔ خوب دھوم دھام کے ساتھ رسم کریا سرانجام پائی ۔ پوجا کے وقت دیوی کی مورتی کے جلوس کی تقریب میں ضلع کے رائے بہادر کی جب قدر عزت اور وقار ہے۔ بڑی بہو کے مان اور عزت کے بارہ میں بھی ویسی ہی بات پھیل گئی ۔ چندن کی لکڑیوں کی چیتا اس علاقہ میں کبھی کسی نے نہیں دیکھی تھی ۔ ایسے ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ شرادھ ہونا صرف اسی گھرانے کیلئے ممکن ہے سُنا جاتا ہے کہ اس رسم کیلئے ان لوگوں کو قدرے قرض بھی لینا پڑا تھا۔

رام سندر کو تسلی دیتے وقت لوگوں نے خاص طور پر اُسے بتایا تھا کہ لڑکی کی رسم کریا کس قدر شان سے ادا کی گئی ہے ۔

اُدھر ڈپٹی مجسٹریٹ کی چٹھی آئی ۔

" میں نے تمام انتظامات مکمل کرلئے ہیں ۔ اس لئے بیوی کو فوراً ہی یہاں بھیج دو ۔ !"

رائے بہادر کی پتنی نے جواب دیا۔

"بیٹا! تمہاری شادی کیلئے ایک دوسری لڑکی پسند کر رکھی ہے
بس فوراً ہی چھٹی لے کر آجاؤ ۔۔۔۔۔!"

اس بار جہیز میں بیس ہزار ملیں گے ۔۔۔ وہ بھی ہاتھوں ہاتھ نقد وصول
ہونے کی اُمید ہے ۔۔۔!

●●

پڑوسن

میری پڑوسن بال ودھوا ہے ۔۔۔ موسم سرما کی اوس میں بھیگے ہوئے ہار سنگھار کے نو شگفتہ پھول کی مانند ۔۔۔ جو سہاگ رات کے پھولوں کی سیج کیلئے نہیں بلکہ دیو پوجا کیلئے کھلا ہو۔

میں اس کی پرستش دل ہی دل میں کیا کرتا تھا۔ اس کے تئیں میرے دلی جذبات کیسے تھے اسے میں پرستش کے علاوہ کسی اور لفظ سے ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے سامنے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے سامنے کبھی نہیں..

نوین مادھو میرا نہایت ہی قریبی اور عزیز ترین دوست ہے۔ اسے بھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں اور اس طرح میں نے اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جس جذبہ کو تھپک تھپک کر سلا رکھا تھا۔ اس کے لئے اندر ہی اندر قدرے فخر بھی محسوس کرتا تھا۔

لیکن پہاڑی ندی کی مانند دل کے طوفان پر کسی طور پر کبھی قابو نہیں پایا جا سکتا کسی بھی راستے کو ہٹا کر وہ باہر نکلنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اس میں اگر وہ کامیاب

نہیں ہوتا تو اندر ہی اندر حیوالاسی بھڑکتی رہتی ہے اسی لئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ شعر وشاعری سے اپنے جذبات کا اظہار کروں گا۔ لیکن قلم پر بھی گویا سکتہ چھا گیا تھا۔ بسیار کوشش کے باوجود میں کچھ بھی نہ لکھ سکا۔

انتہائی تعجب کی بات تو یہ ہے کہ عین اُسی وقت میرے دوست نوین مادھو کو اچانک ہی نہایت جوش وخروش سے شعر کہنے اور نظمیں لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ گویا اچانک ہی زلزلہ سا آگیا ہو۔

اُس بے چارے پر ایسی آفت پیشتر از یں کبھی نہیں آئی تھی۔ اس لئے وہ اس نئی نویلی ہلچل کیلئے بالکل تیار نہ تھا۔ اُس کے پاس قافیہ اور ردیف کا خزانہ نہیں تھا۔ پھر بھی اُس کا دل چھوٹا نہ ہوا یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ بڑھاپے کی نئی دلہن کی مانند اُس پر حاوی ہو گئی تھی۔ نوین مادھو کو قافیہ۔ ردیف وغیرہ کی مدد اور ترمیم کے لئے میرا سہارا لینا پڑا۔

اس کے اشعار کا موضوع نیا نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی پرانا نہیں تھا۔ یعنی اُنہیں جدید ترین بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اور دقیانوسی بھی نہیں۔ عشق ومحبت کے اشعار تھے۔ محبوبہ کے بارے میں۔ میں نے اُسے ایک ٹھوکا لگاتے ہوئے پوچھا۔

"آخر ہے کون ۔۔۔؟ بتاؤ بھی ۔۔۔!!"

نوین نے ہنس کر کہا۔

"ابھی اُس کا پتہ نہیں لگا پایا ہوں۔۔"

نئے مصنف کی مدد کرنے میں مجھے قلبی اطمینان محسوس ہوا نوین کی تخیلی محبوبہ کے تئیں میں نے دلی جذبات واحسات سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ بغیر بچے کی مرغی جس طرح بلغ جتنا بڑا انڈا پایا جانے پر بھی اُسے چھاتی کے نیچے رکھ کر سینے لگتی ہے۔ میں بھی

اُسی طرح نوین مادھو کے جذبات کو اپنے دل کی تمام تر تپش سے سینے لگا۔ اناڑی و نوآموز کی تخلیقات پر میں اس قدر جوش و خروش سے ترمیم کرنے لگا کہ وہ قریب قریب پندرہ آنے میری ہی تخلیقات بن گئیں۔

نوین استعجاب بھرے لہجہ میں کہتا۔

"ٹھیک یہی بات تو میں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہہ نہیں پاتا تھا۔ لیکن تم میں یہ جذبات کہاں سے آجاتے ہیں ___؟"

میں بھی شاعر کی مانند جواب دیتا۔

"تخیل سے ___! اس لئے کہ حقیقت ساکت و جامد ہوتی ہے۔ اور تخیل میں پرواز کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ حقیقی واقعات جذبات کے بیج کو پتھر کی مانند دبا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس تخیل اُس کے راستے کھول دیتا ہے ___!"

"دیکھ رہا ہوں بات کچھ ایسی ہے۔ ٹھیک ہی کہتے ہو ___!!" قدرے توقف کے بعد وہ پھر کہتا ___ "ٹھیک ہی کہتے ہو ___ یہ صحیح بات ہے ___"

پیشتر ازیں بیان کر چکا ہوں کہ میری محبت میں ایک عجیب قسم کی ہچکچاہٹ کے جذبات کی تہہ چھپائی ہوتی ہے۔ اسی لئے میں اپنی زبانی کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔ نوین کو پردے کی مانند درمیان میں رکھنے کے بعد ہی میرا قلم اتنا مُنہ کھول سکا تخیلات گویا میرے دلی جذبات و احساسات کو مکمل طور پر آشکارا کرنے لگے۔

نوین بولا ___

"یہ تو تمہاری ہی تصنیف ہے۔ اسے تمہارے ہی نام سے شائع کریں۔"

"بھئی ___ اب تم نے بھی خوب کہا ___" میں نے جواب دیا۔ "اصل تصنیف تو تمہاری ہے۔ میں نے اس میں تھوڑا سا ردوبدل کر دیا ہے ___"

آہستہ آہستہ نوین کے دل میں یہ بات گھر کر گئی۔
میں بھی کبھی اپنے برابر والے مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ اس بات کو میں جھٹلا نہیں سکتا۔ کبھی کبھی بیچاری کو بھگوان کے درشن بھی ہو جاتے۔ اس سیم تن، نازک اندام حسینہ کی ایک جھلک دیکھ کر دل پر چھائی ہوئی اُداسیوں اور پریشانیوں کی تمام تر تہیں دور ہو جاتیں۔

لیکن اُس دن اچانک ہی میں نے یہ کیا دیکھا ـــ! میرے چندر لوک میں کیا اب بھی جوالا مکھی جاگ رہا ہے۔

اُس دن اپریل کے تیسرے پہر شمال مشرق سے بادل اُٹھ رہے تھے۔ اس گھنگھور گھٹاؤں اور خوشگوار موسم میں میری پڑوسن کھڑکی کے پاس تنہا کھڑی تھی۔ اُس دن اُس کی سیاہ ہرنی آنکھوں میں میں نے جوالا کھڑکتی دیکھی تھی۔

تو پھر ـــ! میرے اس چندر لوک میں اب بھی تپش ہے۔ اب بھی وہاں گرم سانسوں کی ہوا چلتی ہے ـــ وہ دیوتاؤں کیلئے نہیں انسان کیلئے ہے ـــ

اُس دن اس گھنگھور گھٹا کی چھایا میں اُس کی دونوں آنکھوں کی بے تابی اور بے قراری فراق زدہ پرندے کی مانند محو پرواز تھی ـــ سورگ کی طرف نہیں انسانی دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ـــ!!

اُس کی بے قرار اور بھٹکی ہوئی ہرنی کی طرح پریشان نگاہوں کو دیکھ کر میرے لئے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا ـــ اب کسی نو آموز مصنف کے بے تکے اشعار پر اصلاح کرنے کیلئے دل نہ مانا ـــ میرے دل میں کسی قسم کا کام کرنے کی تحریک پیدا ہو گئی۔

اُسی وقت میں نے ارادہ کر لیا کہ میں بنگال میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کے رواج کو شروع کرانے کیلئے اپنی انتہائی کوششیں صرف کر دوں گا۔ صرف تقاریر

اور تحریر سے ہی نہیں۔ مالی امداد دینے کیلئے بھی میں آگے بڑھا۔

نوین میرے ساتھ بحث کرنے لگا۔ اُس نے کہا۔

"بچپن کی بیوگی میں ایک خاص قسم کا مقدس سکون ہے ۔ کیا بیواؤں کی شادی کی باتیں کہنے سے ہی پاکیزگی ختم نہ ہو جائے گی ۔؟"

ایسی جذباتی باتیں سنتے ہی مجھے غصہ آجاتا ہے۔ قحط کے دنوں میں جو شخص خوراک کی قلت کی وجہ سے گھل گھل کر مر رہا ہو۔ اُس کے پاس کوئی صحتمند ہٹا کٹا شخص آکر خوراک کی ضرورت یا ان کے بارے میں نفرت کا اظہار کرتا ہوا پھول کی خوشبو اور بلبل کے گیتوں سے اُس قریب المرگ شخص کا پیٹ بھرنا چاہے تو یہ کیونکر ممکن ہے ۔؟

میں نے غصہ میں آکر کہا۔

"سنو نوین! فنکاروں کا قول ہے کہ کھنڈروں میں بھی حسن پوشیدہ ہوتا ہے لیکن کسی گھر کو صرف تصویر کی شکل میں دیکھنے سے ہی کام نہیں چلتا۔ کیونکہ اُس گھر میں رہنا پڑتا ہے۔ فن کار چاہے کچھ بھی کہتا رہے۔ اُس گھر کی مرمت از بس ضروری ہے۔ بیوگی کے بارے میں اُٹھ بیٹھ کر تم کتنی ہی نظمیں چاہے لکھنا چاہو۔ لیکن یہ تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اُس میں ایک اُداس اور پریشان دل کی آہ و بکا بھی پوشیدہ ہے"

میرا خیال تھا کہ میں نوین کو کسی طرح بھی اپنا ہم خیال نہیں بنا سکوں گا۔ اس لیے میں اس دن کچھ زیادہ ہی گرمی میں باتیں کر رہا تھا۔ لیکن اچانک ہی میں نے دیکھا کہ میری تقریر کے بعد اُس نے ایک گہرا لمبا سانس لیا اور میری ساری باتیں تسلیم کر لیں۔ مجھے اور بھی بہت سی اچھی اچھی باتیں کرنی تھیں۔ لیکن اُس نے اُن کا موقع ہی نہیں دیا۔

تقریباً ایک ہفتہ بعد نوین نے آکر کہا۔

"اگر تم مدد کرو تو میں خود ہی شادی کرنے کو تیار ہوں۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ اُس کی محبوبہ تخیلی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ سے وہ ایک بیوہ عورت سے دل ہی دل میں محبت کرتا رہا ہے۔ لیکن کسی کو اُس نے اپنا ہمراز نہیں بنایا۔ جس ماہنامہ میں نوین کی طرف سے میری نظمیں شائع ہوئی تھیں وہ ماہنامہ ٹھیک جگہ پہونچ جایا کرتا تھا۔ وہ نظمیں ضائع نہیں گئیں ـــــ بغیر ملاقات کئے ہی کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی یہ ترکیب میرے دوست نے تلاش کر لی تھی۔

لیکن نوین کا کہنا تھا کہ اُس نے کوئی گہری سازش کر کے یہ ترکیب نہیں نکالی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا خیال تھا کہ وہ بیوہ پڑھنا بھی نہیں جانتی ـــ ماہنامہ بغیر کسی قیمت کے وہ بیوہ کے بھائی کے نام بھجوا تا رہتا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا دیوتا کی ارادھنا میں پھول چڑھائے جا رہے ہوں ـــ وہ جانیں یا نہ جانیں قبول کریں نہ کریں۔

کوئی نہ کوئی ترکیب نکال کر بیوہ کے بھائی سے نوین نے گہری دوستی کر لی تھی۔ نوین کا کہنا تھا کہ اس میں بھی اُس کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ جس سے محبت کی جائے اُس کے قریبی ساتھیوں کی محبت بھی بھلی لگتی ہے۔

آخر میں بھائی بیمار پڑا تو اس سلسلہ میں بہن کے ساتھ اُس کی ملاقات کیسے ہوئی ـــ؟ یہ ایک لمبی داستان ہے۔

ابھی حال ہی میں مجھ سے بحث میں ہار کر نوین نے اس بیوہ سے مل کر اُس سے شادی کی درخواست کی ہے۔ پہلے تو اُس نے کسی طرح بھی اقرار نہ کیا۔ تب نوین نے میرے دلائل کو استعمال میں لا کر۔ اُس کے ساتھ ہی اپنی آنکھوں کے دو چار بوند آنسو ملا کر اُسے مکمل طور پر ہرا دیا ہے۔ اب سب کچھ طے ہے۔ صرف ودھوا کے سرپرست یعنی اُس کے پھوپھا کچھ روپیہ مانگتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "ابھی لو ـــ!"

"اس کے علاوہ ایک بات اور ہے —" نوین بولا — "شادی کے بعد پانچ چھ مہینے تک پتاجی ضرور خرچ دینا بند کردیں گے — اُس وقت تک ہم دونوں کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے بھی تمہیں تیار رہنا ہوگا —"

میں نے منہ سے کچھ نہ کہہ کر ایک چیک کاٹ دیا اور بولا۔

"اب اس کا نام تو بتاؤ — ! میرے ساتھ جب تمہارا کوئی مقابلہ نہیں تو تعارف میں ہچکچاہٹ کس بات کی — ؟ میں تمہیں چھو کر قسم کھاتا ہوں کہ میں اُس کے نام کوئی نظم نہیں لکھوں گا — اور اگر لکھوں گا بھی تو اس کے بھائی کے پاس نہ بھیجکر تمہارے پاس بھیجدیا کروں گا — !"

"ارے اس بات سے مجھے انکار بھی تو نہیں — !" نوین نے کہا — "دھوا دِواہ کی شرم سے وہ گڑی جارہی ہے۔ اسی لئے اُس نے تم لوگوں سے کسی قسم کا تذکرہ کرنے سے منع کر دیا ہے۔ لیکن اب چھپانا بے کار ہے — وہ تمہاری ہی پڑوسن ہے — انہیں نمبر میں رہتی ہے —

اگر میرا دل لوہے کا بائلر ہوتا تو ٹھیک سے اُڑ جاتا اُس وقت میں نے پوچھا —

"دِھوا دِواہ پر اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے — ؟"
نوین نے ہنس کر کہا۔

"فی الحال تو کوئی اعتراض نہیں ہے —"
"صرف نظمیں پڑھ کر ہی وہ دل دے بیٹھی — ؟"
میں نے پوچھا۔

"کیوں ـــــ ! میری وہ نظمیں اتنی بُری تو نہیں تھیں ـــــ !" نوین نے جواب دیا۔

میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"لعنت ہے ـــ !!"

لیکن لعنت کس پر ـــــ ؟ اُس پر ـــ مجھ پر ـــــــــ یا قدرت پر ـــــــ ؟؟

● ●

بیٹے کی خاطر

دینا ناتھ گاؤں کی سمجھدار شخصیتوں میں سے تھے۔ اس لئے وہ مستقبل کو مدنظر رکھ کر حال کے تمام کام کرتے تھے۔ جب اُنہوں نے شادی کی تو اُنہیں اپنی موجودہ دولہن کے بجائے ہونے والے بچّے کی شکل بصورت صاف طور پر نظر آ رہی تھی۔ منہ دکھائی (شادی) کے وقت نہیں دیکھا جاتا۔۔۔۔۔۔ وہ پکے آدمی تھے۔ اس لئے پریم کی بجائے پنڈ (اولاد) کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔۔۔ یعنی "پُتر کرئے مارگ" (لڑکے لئے شادی کرنی چاہیئے) کی اہمیت کو سمجھ کر اُنہوں نے شادی کی تھی ونودنی سے۔

لیکن اس دُنیا میں سمجھدار آدمی بھی ٹھگے جاتے ہیں۔ عین جوانی کے عالم میں بھی جب ونودنی نے اپنے فرض کی ادائیگی نہیں کی اُس وقت "پُترام نرک" کے دروازے کھلتے دیکھ کر دینا ناتھ ازحد پریشان ہوئے۔ موت کے بعد اُن کی چتا کو کون داغے گا۔۔۔؟ اس بات کے احساس سے وہ موت کا خیال آتے ہی پریشان ہو جاتے۔ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ حال کے مقابلہ میں، وہ مستقبل کو ہی

حقیقی روپ میں مانتے ہیں۔

لیکن نوجوان دنودنی سے اس قسم کی سمجھداری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اُس بے چاری کا نایاب و قیمتی حال، اُس کا نوخیز شباب، بغیر محبت کے بے کار ہی ڈھلا جا رہا تھا۔ یہی اس کیلئے غور و فکر کی بات تھی۔ منو کا پوترو دھان اور وید ناتھ کی ادھیا تمک دیا کھیا اُس کے تشنہ دل کی رتی بھر بھی پیاس نہ بجھا سکی۔

کوئی کچھ بھی کہے، اس عمر میں پریم دینا اور پریم پانا ہی عورتوں کو تمام تر آرام دسکون اور دیگر فرائض کے مقابلہ میں زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے۔

لیکن دنودنی کی قسمت میں پیار و محبت کی باتوں کے بدلے رشتہ داروں کی طعن و تشنیع لکھی تھی۔۔۔ گھر کے تمام افراد اُس پر طعنہ زنی کرتے، اُسے "ونِدھیا" کہہ کر قصوروار ٹھہرایا کرتے۔ ایک کومل سے پودے کی روشنی اور ہوا سے محروم مکان میں رکھنے سے اُس کی جو حالت ہوتی ہے دنودنی کے تشنہ شباب کی بھی وہی حالت ہوئی۔

تمام دن کی کانا پھوسی اور طعنہ زنی سے تنگ آکر وہ کسم کے مکان میں جب تاش کھیلنے جاتی تو اُس وقت اُسے ذرا سے سکون حاصل ہوتا۔ وہاں ہنسی مذاق قہقہے۔ قصے کہانیاں سُننے سُنانے میں کسی قسم کی روکاوٹ نہیں تھی۔

کسم کو کسی دن تاش کھیلنے کو ساتھی نہیں ملتا اُس دن اپنے نوجوان دیور نگیندر کو پکڑ کر لے آتی۔ نگیندر اور دنودنی کے اعتراض کو وہ ہنسی میں اُڑا دیتی۔ اس دُنیا میں ایک سے دوسرا ہوتا ہے اور کھیل ہی کھیل میں کس قدر خطرناک نتائج نکلتے ہیں ان سب گہری اور سنجیدہ باتوں پر نوجوانی کے عالم میں زیادہ دھیان نہیں ہوتا۔

اس بارے میں نگینیدر کے اعتراض کو زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ اور رفتہ رفتہ اُس کے اعتراضات خود بھی ختم ہو گئے۔ اس طرح ونودنی کے ساتھ نگینیدر کی اکثر ملاقات ہونے لگی۔

نگینیدر جب تاش کھیلنے بیٹھتا تو تاشوں سے قطع نظر اُس کا زیادہ تر دھیان ونودنی کی طرف ہوتا۔ اس طرح وہ اکثر تاش میں ہارنے لگا۔ شکست کی اصل وجہ کو سمجھنا کسم یا ونودنی کیلئے مشکل نہ تھا۔ پیشتر ازیں کہا جا چکا ہے کہ کھیل ہی کھیل میں کس قدر خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں، تو جوانی کے عالم میں ان باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی۔ کسم دل ہی دل میں سوچتی یہ عجیب دل لگی ہو رہی ہے۔ اور اس دل لگی ہی میں دل لگی میں کام سدلہ آنے پورا ہو جائے تو حرج ہی کیا ہے۔ ایسا ہو جائے یہ اُس کی دلی خواہش ہی تھی۔ پریم کے نئے پودے کی چپکے چپکے آبپاشی کرنا عورتوں کو بہت بھلا لگتا ہے۔

ونودنی کو بھی بُرا نہیں لگتا — دل جیتنے کے حربوں کو کسی دوسرے مرد پر آزمانے کی خواہش رکھنا قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات غیر اغلب نہیں ہے۔ اسی طرح تاش کی ہار جیت اور خوش آگیں ماحول میں دو کھلاڑیوں کے دل آپس میں مل گئے۔ مالک دو جہان کے علاوہ ایک دوسرے کھلاڑی نے بھی اُسے دیکھا اور لطف حاصل کیا۔

ایک دن دوپہر کے وقت ونودنی، کسم اور نگینیدر تاش کھیل رہے تھے۔ لمحہ بھر بعد ہی کسم اپنے ننھے بچے کی آواز سن کر اُٹھ گئی۔ نگینیدر ونودنی کے ساتھ باتیں کرنے لگا لیکن کیا باتیں کر رہا تھا وہ خود بھی نہ سمجھ سکا۔ اُس کے دل میں عجیب و غریب جذبات اُمڈ رہے تھے اور شدتِ جذبات سے شریانوں میں خون کی روانی بڑھ گئی تھی۔

اچانک ہی اُس نے ظاہری وضعداری اور شرم وحیا کے بندھن کو توڑ کر ونودنی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اُسکے نرم ونازک رخسار پر رکھ دیئے۔ غم وغصہ۔ شرم وحیا کی ماری ونودا خود کو نگیندر کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگی ۔۔۔ عین اُسی وقت گھر کی ملازمہ اُدھر آنکلی ۔۔ ہڑبڑا کر نگیندر نے بازوؤں کا حلقہ ڈھیلا کر دیا۔ اور سر جھکا کر باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

ملازمہ نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

"بہو جی! آپ کو بوا جی بُلا رہی ہیں ۔۔۔ !" ونودا چھلچھلاتی آنکھوں سے نگیندر پر تیز وطرار نظریں ڈالتی ملازمہ کے ساتھ چلی گئی۔

ملازمہ نے جو کچھ دیکھا تھا اُسے مختصر اور جو کچھ نہیں دیکھا تھا اُسے تفصیل وار بیان کر کے دینا ناتھ کے گھر میں طوفان کھڑا کر دیا۔۔۔ ونودا کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہاں تک بے قصور ہے۔ اس بارے میں اُس نے کسی کو بھی سمجھانے کی کوشش نہیں کی۔ سر جھکائے سب کچھ برداشت کر لیا۔

دینا ناتھ آگ بگولہ ہو کر بولے۔

"کلنکنی! تو ہمارے گھر سے نکل کر دور چلی جا ۔۔۔ !"

ونودا خوابگاہ کا دروازہ بند کر کے بستر پر جا لیٹی۔ اُس کی آنسوؤں سے خشک آنکھیں ریگستان کی بنجر زمین کی مانند جل رہی تھیں۔

جب شام کی سیاہیاں گہری ہوگئیں اور باہر کے باغیچہ میں کوے کی بولی بند ہوگئی۔ اُس وقت پُر سکون آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کے دل میں والدین کی یاد جاگ اُٹھی اور تب اُس کے دونوں رُخساروں پر آنسوؤں کا

سیلِ رواں جاری ہو گیا۔

اُسی رات ونودا نے اپنے پتی کے گھر کو چھوڑ دیا۔ کسی نے اُسے تلاش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

اُس وقت ونودا یہ نہیں جانتی تھی کہ "پر جنار تھم رہا گا" عورت اولاد پیدا کرنے کیلئے ہے) وہ عورت کے فطری تقاضے پورے کرنے جا رہی ہے۔ اُس کے خاوند کا پر لوک سنوارنے والا اُس کے پیٹ کے اندر پرورش پا رہا ہے۔

●

اِس واقعہ کو دس سال بیت گئے۔

اس دوران میں ویدیا ناتھ کی مالی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ اُس وقت سے وہ چھوٹا سا گاؤں چھوڑ کر کلکتہ میں بڑا مکان خرید کر رہ رہے ہیں۔

لیکن اُن کی دولت جس قدر بڑھتی تھی، دولت کے وارث کیلئے اُن کا دل اتنا ہی تڑپنے لگتا۔

یکے بعد دیگرے اُنھوں نے دو شادیاں کیں۔ لڑکا پیدا نہ ہوا ہاں دل میں تفکر و تردد، غم و اندوہ ضرور پیدا ہو گیا۔ جیوتشی، پنڈت سنیاسی اور دھونوں سے گھر بھر گیا۔ گنڈے، تعویذ، منتر جنتر اور پیٹنٹ ادویہ کی بارش ہونے لگی۔ اُس کے زندہ نہ رہتے پر کوئی اور لڑکا اُس کا ان کھائے گا۔ اس بات کا احساس کر کے اُسے ان سے بھی نفرت ہو گئی۔

ویدیا ناتھ نے اور ایک شادی کی۔ کیونکہ دُنیا اُمید پر قائم ہے اور اُمید

کا کوئی انت نہیں ہے۔ اور کنیا دینے والوں کے گھر کنیاؤں کی کمی کی نہیں ہے۔

جیوتشیوں نے جنم کنڈلی دیکھ کر کہا۔

"اس کنیا کے پُتر استھان میں ایسا شبھ یوگ دکھائی دیتا ہے کہ اس سے دیناناتھ کے گھر سنتان پیدا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے ۔"

اس کے بعد چھ سال گذر گئے۔ لیکن دیناناتھ کے لڑکا پیدا نہ ہوا۔

مایوسی کی وجہ سے دیناناتھ کی کمر جھک گئی ۔۔۔ بالآخر پنڈتوں کی فرمائش پر ایک بڑے یگیہ کا انتظام کیا گیا۔ اس میں بہت دیر تک بہت سے برہمنوں کی خدمت ہوتی رہی۔

ان ہی دنوں بنگال بہار اور اڑیسہ میں بھیانک قحط پڑا۔ جس وقت دیناناتھ اناج کے درمیان بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے ۔۔۔

"ہمارے اَنّ کو کون کھائے گا ۔۔۔؟"

اُسی وقت سارا بھوکا دیش اپنی ٹوٹی تھالی کی طرف دیکھ کر سوچ رہا تھا ۔۔۔

"کیا کھائیں ۔۔۔؟"

ٹھیک اُسی وقت دیناناتھ کی چوتھی بیوی ایک سو برہمنوں کو روزانہ کھانا کھلا رہی تھی ۔۔۔ ایک سو برہمن صبح کے وقت بھر پیٹ کھانا کھاتے ۔۔۔ اور شام کو جل پان کرتے ۔۔۔

اناج کی بو پا کر قحط زدہ لوگ جوق در جوق دروازے پر جمع ہونے لگے ۔۔۔

اُنہیں دروازے پر سے ہٹانے کے لئے دربان ہر وقت مستعد رہتا تھا۔

ایک دن دالان میں ایک بڑے پیٹ کا سنیاسی دو سیر موہن بھوگ ، اور ڈیڑھ سیر دودھ پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ دیناناتھ کندھے پر ایک چادر ڈالے ہاتھ جوڑے انتہائی عاجزی و انکساری کے ساتھ زمین پر بیٹھے عقیدت سے بھر کر

اُس کے پوتر بھوجن دیوہار کا جائزہ لے رہے تھے۔ اُسی وقت کسی طرح دربان کی نظریں بچا کر ایک دُبلے پتلے کمزور بچے کے ساتھ ایک انتہائی خستہ حال عورت گھر میں داخل ہوئی

کانپتی ہوئی آواز میں اُس نے کہا۔

"بابو ۔۔۔ ! دو روٹی دے دو ۔۔۔ !"

دینا ناتھ ہڑبڑا کر چیخ اُٹھے۔

"گوردیال ۔۔۔ ! گوردیال ۔۔۔ !!"

عورت نے دوبارہ کہا۔

"اے اس بچے کو دو روٹی دے دو ۔۔۔ میں کچھ نہیں چاہتی ۔۔۔ !!"

گوردیال نے آکر بچے اور اُس کی ماں کو بھگا دیا۔

وہ قحط زدہ دُبلا پتلا کمزور بچہ ہی دینا ناتھ کا اکلوتا لڑکا تھا ۔۔۔ ایک سو تندرست و توانا برہمن اور تین بُدھم بُھیم سنیاسی دینا ناتھ کے دل میں لڑکا پیدا ہونے کی خواہش کو جگا کر اُس کا ان کھانے لگے۔

• •

داسی

"تمہاری بہو کے جو الفاظ ہیں وہ تیر کی مانند جس قدر نوکیلے ہیں اُتنے ہی تیز طرار بھی ــــ جس بدقسمت پر اُنہیں استعمال کیا گیا ہے اُس کا دل رہ رہ کر جل اُٹھتا ہے ــــ!" یہ بات خاص طور پر اُس نے خاص طور پر خاوند کو مخاطب کر کے کہی تھی۔

جب رادھا کمد رات کو کھانا کھا کر پان کے ساتھ تمباکو نوش کر کے کھانے سے لطف اندوز ہو کر اُسے ہضم کرنے کی کوشش کر رہے تھے اُسی وقت اُسے بڑی بہو کے منہ سے ایسی کھری کھوٹی باتیں سُننا پڑیں۔ ان باتوں پر اُنہوں نے زیادہ توجہ نہ دی۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر حسبِ معمول سونے چلے گئے۔

لیکن اس قسم کی قوت برداشت سب لوگوں میں ہو اس کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ راس منی نے خاوند سے خوابگاہ میں ایسا برتاؤ کیا جیسا اُن سے کہنے یا کرنے کی جرأت اُس نے آج تک نہیں کی تھی۔ اور دنوں کی طرح آج اُس نے اپنے خاوند کے پاؤں نہیں دبائے۔ آج چلتے ہی وہ بستر پر ایک طرف پڑ کر

رونے لگی۔

رادھا کرد اس طرف توجہ دے کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن اُن کی اس قدر سے بادہن کن حالت نے بیوی کی بے تابی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بولے۔

"مجھے صبح جلدی اُٹھنا ہے اس لئے سونا ضروری ہے۔"

خاوند کی آواز سُن کر راس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رادھا کرد نے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔"

"کیا سُنتا نہیں۔ !!" راس منی نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔

"سُنتا تو ہے۔ لیکن بڑی بہو نے تو سب باتیں ٹھیک ہی کہی تھیں۔ میری پرورش کیا بھیا کے ان سے نہیں ہوئی ہے۔ ؟ تمہارے کپڑے زیورات وغیرہ کیا میں اپنے پتا کے گھر سے لایا ہوں۔ ! جو کھانے پہننے کو دیتا ہے اُسے بھی کھانے پہننے میں شامل کر لیا جا ہئے۔ !!"

"لیکن اس طرح کھانے پہننے سے کیا حاصل ؟"

"زندہ تو رہتا ہی ہے۔ !!"

"اس سے تو موت آجائے یہی اچھا ہے۔ !!"

"جب تک نیند نہیں آرہا اُس وقت تک سونے کی کوشش کرو۔ آرام ملے گا۔ !!" یہ کہہ کر رادھا کرد اپنے خیالات میں مستغرق ہو گئے۔

رادھا کرد اور ششی بھوشن سگے بھائی نہیں ہیں، یہاں تک کہ قریبی رشتہ بھی نہیں ہے۔ صرف گاؤں کا تعلق کہا جا سکتا ہے۔ لیکن پیار اور محبت سگے بھائیوں سے کم نہیں ہے۔ بڑی بہو برج سندری کیلئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت

تھی۔ حالانکہ شستی بھوشن کسی کی طرف داری نہیں کرتے تھے وہ جو چھوٹی بہو کو دیتے تھے۔ وہی بڑی بہو کو بھی دیتے تھے۔ لیکن جس شے کا ایک جوڑا ہی ملتا تھا وہ بڑی بہو کو نہ دے کر چھوٹی بہو کو ہی دے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ بیوی کی فرمائش اور خواہشات کو نظر انداز کر کے رادھا کمد سے اکثر صلاح و مشورہ لیتے رہتے تھے۔ شستی بھوشن کمزور تھے اس لئے رادھا کمد ہی زیادہ تر کام کرتا پڑتا تھا۔ بڑی بہو ہمیشہ اسے شک کی نگاہوں سے دیکھتی تھی کہ رادھا کمد اُسکے خاندان کو لوٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جب اُس کا شک غلط نکلتا تو اُن کا غصہ رادھا کمد پر اُترتا۔ اُن کے غصہ کی یہ آگ بیچ بیچ میں الفاظ کے تیرو نشتر کے ذریعہ جوالا مکھی کی مانند پھوٹ پڑتی تھی۔

یہ کہا نہیں جا سکتا کہ رادھا کمد رات کو پوری طرح سو بھی سکے یا نہیں۔ لیکن صبح اُٹھتے ہی شستی بھوشن کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔

شستی بھوشن بولے۔

"رادھا! ایسے کیوں کھڑے ہو؟ ۔۔۔ کیا تمہاری طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے ۔۔۔؟"

رادھا کمد نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"بھیا ۔۔۔ ! یہاں اب میرا رہنا ممکن نہیں ۔۔۔!"

یہ کہہ کر انہوں نے گذشتہ رات کی ساری بات کہہ سنائی۔

شستی بھوشن نے ہنس کر کہا۔

"یہ بات ہے ۔۔۔ ! یہ تو کوئی نئی بات نہ ہوئی۔ وہ دوسروں کے گھر کی عورتیں ہیں۔ موقع ملتے ہی دو چار باتیں کہیں گی ہی ۔۔۔ اس طرح کیا اپنے آدمی کو گھر چھوڑ کر چلا جانا چاہیئے ۔۔۔ ہمیں بھی تو درمیان میں باتیں سننا پڑتی ہیں۔ لیکن اُنکی

وجہ سے میں گھر کو چھوڑ کر تھوڑا ہی چلا جاؤں گا ۔۔۔!"

رادھا کمد بولے ۔۔

" میں کیا عورت کی بات نہیں سن سکتا۔ لیکن مرد ہو کر حیثم لینے سے کیا فائدہ ؟ مجھے ڈر لگتا ہے کہ میری وجہ سے کہیں آپ کے گھر کا امن و سکون ختم نہ ہو جائے ۔۔۔"

اس کے علاوہ اور زیادہ باتیں نہیں ہوئیں ۔ رادھا کمد اٹھے اور آہستہ سے باہر چلے گئے ۔۔۔ ان کے دل کا بوجھ بدستور قائم تھا۔

ادھر بڑی بہو کا غصہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے ۔ اسے جب کبھی موقع ملتا ہے رادھا کمد کو دو چار کھری کھوٹی سنا دیتی ہے ۔۔۔ راس متی کو بھی اپنے کلمات سے نوازتی رہتی ہے ۔۔۔ رادھا کمد بھی اسی طرح چپ چاپ بیٹھ کر تمباکو پیتے رہتے ہیں اور اسے جنجھلاتے دیکھتے رہتے ہیں ۔۔۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کے لئے یہ سب باتیں ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔

لیکن ان گے شتی بھوشن سے آج کے تعلقات نہیں ہیں دونوں ہی بھائی ایک ساتھ گورو جی کی پاٹھ شالہ میں پڑھتے ہیں اور بھی کبھی وہ آپس میں صلاح کر کے وہ سکول سے بھاگ کر گوالوں کے ساتھ کھیلتے بھی رہے ہیں ۔ گھر کے لوگوں سے چھپ کر رات کو ناٹک دیکھنے جاتے اور صبح کو پکڑے جانے پر سزا پاتے رہے ہیں ۔۔۔ تب کہاں تھیں یہ وج سندری اور راس متی ؟ زندگی کے اس قدر گہرے تعلقات کو کیا ایک ہی آن میں توڑا جا سکتا ہے ؟ لیکن یہ بندھن خود غرضی کا بندھن ہے۔

لیکن اسی وقت ایک اور واقعہ ہو گیا ۔۔۔ جس وقت کی بات کہہ رہا ہوں

اُس زمانہ میں وقت مقررہ پر غروب آفتاب سے قبل اگر لگان ادا نہیں کر دیا جاتا تھا تو زمیندار کی جائیداد نیلام کر دی جاتی تھی۔

ایک روز خبر ملی کہ ششی بھوشن کی زمینداری نیلام ہو گئی۔ رادھا کمد اپنے مخصوص لہجہ میں بولے۔

" اس میں قصور میرا ہے ۔۔ ؟"

اس پر ششی بھوشن نے کہا۔

" بھیا ۔۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ تم نے لگان بھیج ہی دیا تھا۔ لیکن اُسے راستہ میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ۔۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہو سکتا ہے ۔۔ ؟ اس وقت تو کنبہ کی پرورش کی فکر کرنی ہے۔ بے کار یہ سوچنا کہ غلطی کس کی ہے۔ وقت ضائع کرنا ہے ۔۔"

ششی بھوشن کچھ کر بیٹھے۔ یہ اُن کی عادت نہیں ہے۔ وہ گویا تالاب کی پھسلنی سیڑھی سے پھسل کر گر پڑے۔ ششی بھوشن بیوی کے زیورات کو گروی رکھنے پر تیار ہو گئے۔ لیکن اُسی وقت رادھا کمد نے ایک تھیلی روپوں کی لا کر اُن کے سامنے رکھ دی۔ اُنھوں نے پہلے ہی بیوی کے زیوروں کو گروی رکھ کر روپیہ حاصل کر لیا تھا۔

گھر میں بہت زیادہ تبدیلیاں ہو گئیں ۔۔ گھر کی مالکن جسے اچھے وقت میں گھر سے الگ کرنے کی سوچ رہی تھی، مصیبت کے وقت اُسے ہی برداشت کرنا پڑا ۔۔ اس وقت دونوں بھائیوں میں سے کس پر انحصار کیا جا سکتا ہے ۔۔ ؟ اُسے یہ سمجھتے دیر نہ لگی۔ وہ اب بالکل نہیں سوچتی کہ کبھی وہ رادھا کمد کے تئیں اپنے دل میں نفرت اور حقارت کے جذبات رکھتی تھی۔

رادھا کمد پہلے ہی آزادانہ طور پر کام کاج کرنے کیلئے تیار ہو چکے تھے۔

نزدیکی شہر میں ہی وہ مختاری کرنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ وہاں اُن کا کام جم گیا اور اُنہیں بڑے بڑے زمینداروں کے یہاں سے کام ملنے لگا۔

اب راس منی کی حالت پہلے بہت مختلف تھی۔ اب ششی بھوشن اور برج سندری راس منی کے ان سے ہی گذر اوقات کر رہے تھے۔ اُس نے اس بات پر کبھی اعتراض کیا یا نہیں، یہ تو پتہ نہیں۔ لیکن کسی دن اُس نے بڑی بہو کے خواہش کے خلاف کچھ کہا تھا لیکن یہ صرف ایک ہی دن کہا تھا۔ دوسرے دن اُن سے چھوٹی بہو پہلے سے بھی زیادہ نرم دل ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ بات رادھا کمد کے کانوں تک پہونچ گئی تھی۔ اُسی رات رادھا کمد نے چھوٹی بہو کو اُس کے پتا کے گھر پہونچانے کا انتظام کر دیا تھا۔ اور سات دن تک اُس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ بالآخر برج سندری نے میاں بیوی کی خوشامد کر کے صلح کرائی تھی۔

رادھا کمد گھر کے خرچ کیلئے سارا روپیہ برج سندری کو دیتے تھے راس منی اپنی ضروریات کے مطابق بڑی بہو سے لیا کرتی تھی۔ گھر میں بڑی بہو کی عزت پہلے سے بھی زیادہ تھی۔

ششی بھوشن کی منہ کی ہنسی تو پہلے جیسے ہی تھی۔ لیکن وہ اندرونی بیماری سے روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا۔۔۔۔ یہ کسی اور نے نہیں دیکھا تھا۔ صرف راس منی رات کو جاگ کر دیکھتی کہ رادھا کمد بھیا کا چہرہ دیکھ کر ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کروٹیں بدل رہے ہیں۔

رادھا کمد ششی بھوشن کو دلاسہ دیتے ہوئے کہتے۔

"تمہیں کوئی فکر نہیں ۔۔۔ اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمہاری تمامتر جائیداد واپس لے آؤں گا ۔۔۔!!"

اس بات میں ناقص زیادہ دیر لگی

جس سے منشی مکوشن کی زمینداری نیلام میں خریدی تھی وہ کاروباری آدمی تھا اور زمینداری کے کام سے بالکل نابلد تھا۔ یہ زمینداری اُس نے صرف عزت اور وقار حاصل کرنے کیلئے خریدی تھی۔ لیکن لگان اُسے گھر سے ہی دینا پڑتا تھا۔ اُسے زمینداری سے بالکل فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اب رادھا کمد کو بھی عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اس کے برعکس کاروباری زمیندار کو سب نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ زمینداری کے تمام لوگ رادھا کمد کے مشورہ سے بیوپاری زمیندار کے خلاف بیوپار کرنے لگے۔ آخر میں وہ بیچارہ اس جھنجھٹ سے بہت زیادہ پریشان ہوگیا۔ رادھا کمد نے بڑے کم قیمت میں اپنی پہلی جائیداد خریدلی۔

دس سال گزر گئے ... اس دس سال کے عرصہ میں منشی مکوشن ذہنی پریشانی اور روحانی اذیت کی وجہ سے قریب المرگ ہو گئے تھے۔ وہ اپنی جائداد دوبارہ حاصل کرکے خوش نہیں ہوئے۔ اُن کا دل گویا ٹوٹ چکا تھا ... اُنہیں کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔

زمینداری کے گاؤں کے لوگوں نے خوشی ظاہر کی۔ وہ سب منشی مکوشن سے دعوت کا انتظام کرنے کیلئے کہنے لگے۔ منشی مکوشن نے اس بارہ میں رادھا کمد سے مشورہ لیا۔

رادھا کمد بولے ...

"ضرور ہو یا ضرور دعوت ہو اور یقیناً خوشی منائی جانی چاہیئے ..."

دعوت کا انتظام کیا گیا۔ گاؤں میں اس قسم کی دعوت کبھی نہیں ہوئی تھی گاؤں کا ہر شخص مدعو کیا گیا تھا۔ برہمنوں کو دکھشنا اور غریبوں کو کپڑے اور کھانا وغیرہ دیا گیا۔ وہ سب آشیرواد دیتے ہوئے چلے گئے۔

سردیوں کے شروع میں موسم قدرے خراب تھا۔ اس کے باوجود تین دن تک دعوت چلتی رہی۔ اس میں ستشی بھوشن نے بہت زیادہ کام کیا تھا۔ ان کا کمزور جسم اس محنت کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ بیمار ہو گئے۔ انہیں کپکپی سے بخار آنے لگا۔

وید نے کہا۔
بیماری خطرناک ہے ۔۔ !!"
رادھا کمل رات کو دوسرے تیسرے پہر میں مریض کے گھر میں سے سب کو نکال کر بولے۔

"بھیا۔۔ ! آپ کی غیر حاضری میں جائیداد میں سے کتنا کس کو دینا پڑے گا۔۔ ؟ یہ سب بتا دیجئے ۔۔ !!"
" بھائی ! میرے پاس کیا ہے جو میں کسی کو دوں گا ۔۔ !!" ستشی بھوشن گلوگیر آواز میں بولے ۔۔ !
"سبھی تو آپ کا ہے ۔۔ !!" رادھا کمل نے کہا۔
"کسی زمانہ میں یہ سب کچھ میرا تھا لیکن اب نہیں ہے ۔۔ !" ستشی بھوشن بولے۔

رادھا کمل بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن جب ستشی بھوشن کو سانس لینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی تو انہوں نے ان کے پیر پکڑ کر کہا۔
"بھیا ۔۔ ! میں نے جو گھور پاپ کیا ہے وہ اور کہہ دوں ۔۔ ! کیونکہ اب اور وقت تو ملے گا نہیں ۔۔ !!"
ستشی بھوشن خاموش رہے۔ رادھا کمل نے اسی طرح مخصوص اُپرسکون لہجہ میں بیچ بیچ میں گہرا ٹھنڈا سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔۔

"بھیّا! مجھ میں ہمت نہیں کہ میں۔ سب باتیں اچھی طرح کہہ سکوں میرے دل کی صحیح حالت بھگوان جانتے ہیں۔ زمین پر اور کوئی نہیں جان سکتا۔ بچپن سے میرے اور تمہارے دل میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ اگر بھید تھا تو صرف باہر کا ـــــ تم امیر اور میں غریب تھا۔ میں نے اسی وجہ سے اپنے اور تمہارے درمیان گہری کھائی دیکھی تو خود ہی اس بھید کو مٹا دیا۔ میں نے ہی تمہارا لگان لُٹوا کر جاگیر نیلام کرا دی تھی ـــ"

یہ سُن کر ششی بھوشن کو اتنا سا بھی تعجب نہ ہوا۔ وہ بولے۔

" بھائی! یہ تم نے اچھا ہی کیا تھا۔ لیکن جس لئے تم نے یہ کیا تھا اُس میں کامیاب نہ ہوئے۔ تم اپنے پاس کیا رکھ سکے .... ؟"

ششی بھوشن کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں آنسو چھلچھلانے لگے۔

رادھا کمل اُن کے قدموں پر اپنی پیشانی رکھ کر بولے۔

"بھیّا! مجھے معاف کر دیا یا نہیں ـــ ؟"

ششی بھوشن نے اُنہیں پاس بُلا کر ہاتھ پکڑ کر کہا۔

" بھائی ـــ! یہ بات میں پہلے ہی سے جانتا تھا جن لوگوں کے ساتھ مل کر تم نے یہ سازش کی تھی۔ اُنہی لوگوں نے مجھے یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے تو تمہیں اُسی وقت معاف کر دیا ـــــ"

رادھا کمل اب دونوں ہاتھوں سے موُنہہ ڈھانپ کر رو دینے لگے بہت دیر بعد بولے۔

" بھیّا! اگر مجھے معاف کر دیا ہے تو اپنی یہ جائیداد تمہیں قبول کر لو۔ اُسے ناراض ہو کر مت لوٹاؤ ـــ"

ششی بھوشن کے مُنہ سے کوئی جواب نہ نکلا ـــ اُن کی

قوتِ گویائی ختم ہو گئی تھی ــــــ اُنہوں نے رادھا کمد کی طرف سطحی نظروں سے دیکھ کر اپنا داہنا ہاتھ اُٹھایا ــــ اُس کا کیا مطلب ہوا ــ یہ سمجھ میں نہیں آیا لیکن شاید رادھا کمد سمجھ گئے تھے ــــــ!!

●●

گھاٹ کی بات

پتھروں پر اگر حادثات و واقعات ثبت رہتے تو کتنے ہی دنوں کی کتنی ہی باتیں میری ہر سیڑھی پر پڑھی جا سکتیں۔ پرانی باتیں اگر سننا چاہتے ہو تو انہی سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤ —— دل لگا کر پانی کی لہروں کی جانب کان لگا دو زمانۂ قدیم کی کتنی ہی بھولی بسری باتیں تم سن سکو گے۔

مجھے آج ایک دن کی بات یاد آ رہی ہے۔ وہ بھی ٹھیک ایسا ہی دن تھا موسم برسات شروع ہونے میں دو چار دن باقی تھے۔ صبح کے وقت ادبہاری کے سرد جھونکے شب کے جاگے ہوؤں کے جسم میں نئی تازگی لا رہے تھے۔ درختوں کے پتے گویا کانپ جاتے تھے۔

گنگا بھری ہوئی تھی۔ میری صرف چار سیڑھیاں ہی پانی کے اوپر جاگ رہی تھیں۔ پانی کے ساتھ گویا خشکی بغلگیر ہو رہی تھی۔ کنارے پر آم کے باغیچہ کے نیچے جس جگہ اروی کا جنگل تھا۔ وہاں تک گنگا کا پانی جا پہنچا تھا۔ ندی کے اس کنارے کے پاس پرانی اینٹوں کے بھٹے چاروں طرف پانی کے درمیان

اُبھر رہے تھے۔

ملاحوں کی جو کشتیاں ببول کے درختوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں وہ سب علی الصبح کے جوار کے پانی پر تیرتی ہوئی ڈگمگا رہی تھیں۔ پُر شباب جوار کا پانی رنگیلا بن کر اُن کے دونوں جانب چھل چھل حملہ کر رہا تھا۔ اُن کے کانوں کو پکڑ کر آہستہ آہستہ ہلاتا ہوا جا رہا تھا۔

بھری ہوئی گنگا کے اوپر موسم سرما کی جو دھوپ پڑ رہی تھی۔ اُس کا کچے سونے جیسا رنگ چمپا کے پھولوں جیسا رنگ تھا۔ دھوپ کا ایسا رنگ اور کہیں نہیں دیکھا جاتا ۔۔ ریت کے اوپر جمے کانس بن کر اوپر دھوپ پڑ رہی تھی۔ اُس وقت تک کانس کے پھول سب نہیں کھلے تھے۔

رام رام کہہ کر ملاحوں نے کشتیاں کھول دیں۔ پرندے جس طرح پنکھ پھیلا کر خوشی کے ساتھ نیلے آسمان پر اُڑتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں اُسی طرح پال پھیلا کر سورج کی کرنوں میں نکل پڑیں۔ وہ سب پرندوں جیسی ہی لگ رہی تھیں۔ وہ سب راج ہنسوں کی مانند پانی پر تیر رہی تھیں۔ لیکن خوشی کی وجہ سے دونوں پنکھوں کو آسمان میں چھوڑ دیا تھا۔

بھٹا چاریہ مہاشہ ٹھیک وقت مقررہ پر پنچ پاتر لیے ہوئے نہانے کو آئے تھے۔ عورتیں بھی دو ایک کر کے پانی بھرنے کو آئی تھیں۔

وہ بہت زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے۔ تم لوگوں کو چاہئے یہ بات بہت دنوں کی ہی لگے۔ لیکن میرے دل کو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ آج ہی کی بات ہے۔ یہ دن تو گنگا کی روانی کے اوپر کھیلتے کھیلتے بہہ جاتے ہیں۔ بہت دنوں سے نہایت سنجیدگی سے اس کو دیکھ رہا ہوں اس لئے وقت بہت زیادہ ہو گیا ایسا نہیں لگتا ۔۔ میرے دن کی روشنی اور رات کی چھایا

روزانہ گنگا کے اوپر پڑتی ہے ۔ . . . .

. . . . پھر روزانہ گنگا کے اوپر سے مٹ جاتی ہے ۔ کہیں بھی اُسکی تصویر نہیں دیکھی جا سکتی ۔ اس لئے اگرچہ مجھے بزرگ کی طرح دیکھا جاتا ہے ۔ لیکن میرا دل بالکل جوان اور نیا ہے ۔ اتفاق سے ایک کائی کا ٹکڑا بہتا ہوا آکر جسم سے لگ جاتا ہے ۔ پھر روانی میں بہہ جاتا ہے ۔ اُس کی وجہ سے یہ کچھ نہیں ہے ایسا بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ جہاں پر گنگا کی روانی نہیں پہونچتی وہاں میرے سوراخوں میں بھی کائی پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہی میری قدامت کی گواہ ہے ۔

وہ سب ہی زمانۂ قدیم کی یادوں کو ہاتھوں ہی جکڑ کر ہمیشہ مدھر، خوش آگیں اور نیا بنائے رکھتے ہیں ۔ گنگا میرے پاس سے روزانہ ایک ایک سیڑھی اُترتی چلی جاتی ہے ۔ میں بھی ایک ایک سیڑھی کر کے قدیم ہوتا جاتا ہوں ۔

چکرورتی کے گھر کی وہ جو بزرگ عورت رام تانی اوڑھے کا نپتی کانپتی مالا جپتی جپتی نگر کو لوٹ کر جا رہی ہے اُس کی نانی اُس وقت اتنی ہی بڑی تھی ۔ مجھے یاد ہے اُس کا ایک کھیل تھا ۔ وہ روزانہ گیکوار کا ایک پتہ گنگا کے پانی میں بہا دیتی تھی ۔ میرے جنوبی بازو کے پاس ایک بھنور سا تھا ۔ اُس جگہ پر پتیا باقاعدہ گھومتا گھماتا بہتا رہتا ۔ وہ گاگر رکھ کر کھڑی ہو اُس کو دیکھتی رہتی ـــــ جب دیکھا ، کچھ دن بعد وہی لڑکی پھر بڑی ہو کر اپنی ایک لڑکی کو ساتھ لے کر پانی بھرنے آئی ـــــ وہ لڑکی بھی پھر بڑی ہو گئی ۔ بچیوں کو پانی اُچھالتے اور اودھم مچاتے وقت وہ اُن پر رعب جماتی اور اچھے برتاؤ وسلوک کی تعلیم دیتی ۔ اُس وقت مجھے وہی گیکوار کے پتے کی ناؤ بنا کر بہانا یاد آ جاتا ۔

جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ لبوں پر آتی ہی نہیں ـــــ ایک بات کہتے کہتے بہاؤ میں کیا دوسری بات بہہ جاتی ہے ۔ پکڑ کر نہیں رکھ پاتا ـــــ صرف ایک ایک کہانی

اسی گھمی گنوار کی کشتی کی مانند کھنکوں میں پھنس کر بار بار لوٹ آتی ہے ۔ اُسی طرح ایک کہانی اپنی تفصیل لے کر آج میرے پاس لوٹ لوٹ کر بہہ رہی ہے ــــــ کس وقت ڈوبے گی ـــ ؟ کس وقت ڈوبے گی ـــــ ؟؟ پتّے کے ٹکڑے کی مانند وہ بہت چھوٹی ہے ـــ اس سے زیادہ کچھ نہیں ـــ وہ کھیلنے کے پھول ہیں ـــ اُسے ڈوبتے دیکھ کر معصوم بچی ایک گہرا لمبا سانس کھینچ کر گھر لوٹ جائے گی ـــ !

مندر کے پاس جہاں پر وہ گوسائیوں کی گئوشالہ کا بیڑا ہے، اُس جگہ پر ایک ببول کا پیڑ ہے۔ اُسی کے نیچے ہفتہ میں ایک دن کے حساب سے بازار لگتا تھا۔ اُس وقت بھی گوسائیں لوگ یہاں نہیں رہتے تھے۔ جس جگہ پر ان لوگوں کا چنڈی منڈپ ہے اُس جگہ پر ایک معمولی سی گھاس پھونس کی جھونپڑی تھی ۔

یہ برگد کا درخت آج جو میری پسلی پسلی میں بانہیں پھیلا کر کھڑا ہے اُس وقت ایک چھوٹا سا پودا تھا۔ نرم و نازک پتّوں کیلئے سر اُٹھائے کھڑا تھا ـــــــ ۔ دھوپ چڑھنے پر اُس کے پتّوں کا سایہ میرے اوپر سارے دن کھیلا کرتا، اُس کی نئی جڑیں، بچوں کی اُمنگوں کی مانند میری چھاتی کے پاس کُل بُل کرتیں ـــ کوئی اُس کا ایک پتہ توڑتا تو مجھے تکلیف ہوتی تھی ۔

اگرچہ عمر بہت ہو چکی تھی، پھر بھی اُس وقت میں سیدھا تھا۔ آج جس طرح میرے کنارے ٹیڑھے میڑھے پڑ گئے ہیں اور ہزاروں دراڑ دِن پڑ گئی ہیں میرے بطن کے اندر دُنیا بھر کے مینڈک اپنی سردیوں کی ٹھٹھرتی ہوئی نیند کا انتظام کرتے ہیں، اُس وقت میری یہ حالت نہ تھی۔ صرف میرے بازو کی باہری جانب دو اینٹوں کی کمی تھی۔ اُس کے اندر ایک چڑیا نے گھونسلہ بنا لیا تھا۔ صبح کے وقت وہ کروٹ بدلتی ہوئی جاگ اُٹھتی۔ مچھلی کی دُم کی طرح اپنی ڈبل دُم کو

دو چار بار جلدی سے نیچا کر سیٹی دیتی آسمان کی طرف اُڑ جاتی۔ اُس وقت میں جانتا کہ کسم کے گھاٹ پر آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

جس لڑکی کی میں بات کہہ رہا ہوں گھاٹ کی دیگر لڑکیاں اُسے کسم کہہ کر پکارتی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ کسم ہی اُس کا نام ہوگا۔ پانی کے اوپر جس وقت کسم کی چھوٹی سی چھایا پڑتی اُس وقت میرا جی چاہتا اُس چھایا کو اگر پکڑ کر رکھ سکوں تو اُسے اپنے پتھروں سے باندھ کر رکھ لوں۔ ایسی اُس کی ایک عادت تھی۔ وہ جب وقت میرے پتھروں کے اوپر پاؤں رکھتی اور اُس کے پاؤں کے گھنگھرو بجنے لگتے اُس وقت میں دل ہی دل میں جھومنے لگتا۔ کسم بہت کھیل کرتی ہو، بہت شور مچاتی ہو یا ہنسی تماشہ کرتی ہو ایسی بات نہیں ہے۔ اس کے باوجود تعجب اس بات پر ہے کہ جس قدر خوبصورت اور حسین تھی۔ ایسی اُس کی کوئی سہیلی بھی نہ تھی۔ کوئی اُسے کہتی "کسی"۔ کوئی اُس کو کہتی "خوشی" کوئی اُسے کہتی "راکھشسنی"۔ اُس کی ماں اُسے کہتی "کسمی"۔ میں جب بھی دیکھتا ــــ کسم پانی کے کنارے بیٹھی ہے ــــ پانی کے ساتھ گویا اُس کے دل کا کوئی خاص رشتہ ہے۔ وہ پانی کو بہت پیار کرتی تھی۔

کچھ دن بعد میں کسم کو پھر دیکھ نہیں سکا۔ "بھون" اور "سورن" نے گھاٹ پر آ کر بتا اُن کی "کسی"۔ "خوشی"۔ "راکھشسنی" کو سسرال لے جایا گیا ہے۔ سُنا جس جگہ اُسے لے جایا گیا ہے وہاں نزدیک کہیں گنگا نہیں ہے اُس جگہ نئے سرے سے سب نئے لوگ ہیں ــــ پانی کے کنول کو گویا کوئی بنجر زمین میں کاشت کرنے کیلئے لے گیا ہے۔

آہستہ آہستہ سب لوگ کسم کی باتیں بھول گئے۔ ایک سال بیت گیا گھاٹ کی لڑکیاں کسم کی کہانی نہیں چھیڑتیں ــــ ایک دن شام کے وقت

جانے پہچانے قدموں کے لمس سے میں جیسے چونک پڑا۔ دل کو محسوس ہوا کہ گویا کسم کے پاؤں ہیں۔ وہ ہی تھی۔ لیکن اُن پاؤں میں اب گھنگھرو نہیں بجتے تھے اُن پاؤں میں وہ سنگیت نہیں تھا۔ میں کسم کے قدموں کا لمس اور گھنگھروؤں کے الفاظ بہت دنوں تک ایک ساتھ محسوس کرتا آیا تھا۔ آج اچانک اُن گھنگھروؤں کے الفاظ کو نہ سُن کر، شام کے وقت رواں دواں پانی کی آواز کس طرح کانوں میں زہر گھولنے لگی۔ آم کے باغیچے میں پتوں کی جھنجھناتی ہوئی ہوا کس طرح ہاہاکار کر اُٹھی ــــ کہہ نہیں سکتا۔

کسم دوھوا ہو گئی تھی ــــ سُنا اُس کا پتی پردیس میں نوکری کرتا تھا ــــ دو ایک دن چھوڑ کر پتی کے ساتھ ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ خط کے ذریعہ بیوگی کی خبر پاکر آٹھ سال کی عمر میں ماتھے کا سیندور، پونچھ کر جسم سے گہنے اُتار کر پھر اپنے دیس میں اُسی گنگا کے کنارے لوٹ آئی ہے۔ مگر اُس کی سہیلیوں میں اب کوئی نہیں ہے ــــ بھون۔ سورن اور املا سُسرال چلی گئی ہیں۔ صرف شرد ہے۔ لیکن سُنتے ہیں کہ اُس کی بھی مستقبل قریب میں شادی ہو جائے گی۔ کسم بالکل اکیلی رہ گئی۔ لیکن وہ جب دقت دونوں گھٹنوں کے اوپر پیشانی رکھ کر چپ چاپ میری سیڑھیوں پر بیٹھی ہوتی اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا۔ گویا ندی کی سب لہریں مل کر ہاتھ اُٹھائے ہوئے اُسے کُنتی، خوشی، راکشتی کہہ کر پکار رہی ہوں۔

برسات کی ابتدا میں جس طرح گنگا دیکھتے ہی دیکھتے اُمنڈنے لگتی ہے اسی طرح کسم پر بھی حسن و شباب اُمنڈنے لگا۔ لیکن اُس کے لباس۔ سنجیدہ چہرے اور پُرسکون تاثرات وجذبات نے اُس کے شباب پر ایک ایسی تہہ سی چڑھا دی تھی کہ وہ شباب اور وہ حسن وجمال ایک عام آدمی کی نظر میں نہیں آتا۔ کسم بڑی ہو گئی ہے۔ یہ گویا کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ اُس کے گھنگھرو تو نہیں تھے لیکن وہ جس وہ......

وقت چلتی، دمیں اُن ہی گھنگھرووں کی آواز سُن پاتا۔ اس طرح، دس سال کیسے بیت گئے گاؤں کے لوگوں میں سے جیسے کوئی بھی نہ جان پایا۔

میں آج جیسا دیکھ رہا ہوں۔ بھادوں کے مہینے میں ایسا ہی ایک دن آیا۔۔۔ تم لوگوں کی پڑدادیوں نے اُس دن علی الصبح اُٹھ کر اُس طرح کی دلکش سورج کی روشنی دیکھی تھی۔ وہ سب جس وقت ایک ہاتھ کی گھونگھٹ کھینچ کر گاکر اُس کے لئے ہوئے صبح کی روشنی کو اور بھی تیز طرار کرنے کیلئے پیڑ پودوں کے درمیان ہوتی ہوئی گاؤں کی اونچی نیچی سڑک پر باتیں کرتی کرتی چلی آرہی تھیں اُس وقت تم لوگوں کا خیال بھی اُن کے دل کے گوشوں میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ تم لوگ جس طرح ٹھیک سوچ بھی نہیں سکتے۔ تم لوگوں کی دادیاں سچ مچ ہی ایک دن کھیل کرتی ہوئی بھاگ گئی تھیں آج کا دن جس طرح حقیقت ہے وہ دن بھی ٹھیک اسی طرح حقیقت تھا۔ تم لوگوں کی طرح نوجوان دل لئے سکھ دُکھ سے وہ بھی تم لوگوں کی طرح ڈگمگاتی ہوئی جھولی تھیں اُسی طرح آج کا یہ موسم سرما کا دن اُن کی غیر موجودگی میں بھی آج کے اس موسم سرما کے سورج کی کرنوں سے جگمگاتی ہوئی تصویر سب ایک سپنا ہے۔

اُس دن صبح ہونے سے پہلے ہی شمالی ہوا آہستہ آہستہ شروع ہو کر کھلے ہوئے ببول کے پھولوں کو اُڑاتی ہوئی ایک آدھ کو میرے اوپر پھینک دیتی تھی۔ میرے پتھروں کے اوپر کچھ کچھ اوس کی بوندیں پڑی ہوئی تھیں اُس دن علی الصبح ہی کہیں سے تندرست و توانا، خوش شکل گورے جسم اور تیجسوی سنیاسی نے آکر میرے سامنے والے شیو مندر میں ڈیرہ ڈالا۔۔۔ سنیاسی کی آمد کی بات سُن کر گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ عورتوں نے گاگر رکھ کر باباجی کو پرنام کرنے کیلئے مندر میں جا کر بھیڑ کردی۔

بھیڑ روز بروز بڑھنے لگی۔۔۔ ایک تو سنیاسی، اُس پر اس قدر

خوب رو، خوش شکل۔ اس کے باوجود وہ کسی کو نظر انداز نہیں کرتے۔ بچوں کو گود میں لے کر ٹہلاتے۔ ماتاؤں سے گھر گرہستی کی باتیں پوچھتے۔ ناری سماج میں چند دنوں میں اُن کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ اُن کے پاس مرد بھی بہت آتے۔ کسی دن بھگوان کا سمرن کرتے۔ کسی دن بھگوت گیتا کا اُپدیش سُناتے۔ کسی دن مندر میں بیٹھ کر بہت سے شاستروں کو لے کر تذکرہ چھیڑ دیتے۔

اُن کے پاس کوئی اُپدیش لینے آتا۔ کوئی منتر لینے آتا۔ کوئی بیماری کی دوا لینے آتا۔ عورتیں گھاٹ پر آکر بات چیت کرتیں۔

"اوہ۔۔۔! کیا روپ ہے۔۔۔! ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مہادیو انسانی چولے میں مندر میں براجمان ہو گئے ہیں۔۔۔!!"

جس وقت سنیاسی علی الصبح طلوعِ آفتاب سے قبل شکر تارے پر نظر جما کر گنگا جل میں کھڑے ہو انتہائی سنجیدگی اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں پوجا کرتے اُس وقت میں پانی کی "کل کل" نہیں سُن پاتا۔ اُن کی اس آواز کو سُنتے سُنتے روزانہ گنگا کے مشرق میں آسمان خونین ہو جاتا۔ بادلوں کے کنارے کنارے لال رنگ کی لکیریں پھیل جاتیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ گویا یہ مہاپرش گنگا کے پانی میں کھڑے ہو مشرق کی طرف دیکھ کر جو ایک مہا منتر پڑھتے ہیں اُس کے ایک ایک شبد کا اچارن ہونے کے ساتھ ہی رات کی تاریکی ختم ہو جاتی ہے چاند تارے مغرب میں بُجھ جاتے ہیں۔ سورج مشرق کی جانب آسمان میں اُبھرنے لگتا ہے۔۔۔ دُنیا کا منظر یکسر بدل جاتا ہے۔۔۔ یہ کون عظیم شخصیت ہے۔۔۔؟

اشنان کر کے جس وقت انتہائی پاک اور پوتر جسم لے کر پانی سے باہر نکلتے اُن کی جٹاؤں سے پانی کی بوندیں جھر جھر کر گرنے لگتیں۔ اُس وقت اُن کے جسم پر سورج کی کرنیں پڑ کر عجب انداز سے چمکنے لگتیں۔

اسی طرح اور بھی کئی مہینے کٹ گئے چیت کے مہینے میں سورج گرہن کے
وقت بہت سے لوگ اشنان کو آئے۔ ببول کے نیچے بھاری میلہ لگ گیا
اس موقع پر ستیا سی کو دیکھنے کیلئے بھی جوق در جوق آئے جس گاؤں میں کسم کی
سسرال تھی وہاں سے بہت سی عورتیں آئی تھیں۔
علی الصبح میری ٹیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ستیا سی جپ کر رہے تھے
اُنہیں دیکھتے ہی ایک عورت دوسری عورت کے جسم کو نوچتے ہوئے بولی۔
"اری یہ تو ہماری کسم کے پتی ہیں ——!"
ایک اور عورت وہ انگلیوں سے گھونگھٹ کو قدرے سرکا کر بولی
"اری میا —! وہی تو ہیں۔ یہ تو ہمارے جیٹھ جیول کے گھر کے
چھوٹے بالو ہیں —"
ایک عورت جس نے گھونگھٹ نہیں نکال رکھا تھا بولی۔—
"آہا ——! ویسی ہی پیشانی — ویسی ہی ناک، ویسی ہی آنکھیں!!!"
ایک اور عورت ستیا سی کی طرف دیکھے بغیر ہی گہرا ٹھنڈا سانس
چھوڑتے ہوئے گاگر سے پانی ڈھکیلتے ہوئے بولی۔
"ہائے ——! وہ کیا پھر آئے ہیں —؟ وہ کیا پھر آئینگے۔؟
کسم کا بھاگیہ کیا ایسا ہے ——؟"
اُس وقت کسی نے کہا۔
"اُن کے اتنی بڑی داڑھی نہیں تھی —"
کوئی بولی۔
"وہ ایسے اکہرے بدن کے نہیں تھے ——!"
کسی نے کہا۔

"وہ اتنے لمبے نہیں تھے ـــــ؟"

اس طرح بات کا کسی حد تک فیصلہ ہو گیا۔ بات آگے چلی نہیں ـــ گاؤں کے اور سبھی لوگوں نے سنیاسی کو دیکھا تھا۔ صرف کسم نے نہیں دیکھا تھا۔ بہت لوگوں کی آمدورفت ہونے کی وجہ سے کسم نے میرے پاس آنا ایک دم بند کر دیا تھا ـــ ایک دن شام کے وقت پونم کے چاند کو ابھرتے دیکھ کر شاید اُسے ہمارا پُرانا رشتہ یاد آ گیا۔

اُس وقت گھاٹ پر کوئی اور شخص نہیں تھا۔ جھینگر جھنکار رہے تھے مندر کا کانسے کا گھنٹہ بجے ہوئے کچھ دیر ہو گئی ۔ اُس کی آخری جھنک مدھم ہوتی ہوئی دور ـــ بہت دور کنارے پر لگے جنگلوں میں سائے کی مانند مدغم ہو گئی ـــ بھرپور چاندنی تھی ـــ جوار کا پانی چھل چھل کر رہا تھا ـــ مجھ پر چھایا پھیلاتی ہوئی کسم آ بیٹھی ـــ ہوا زیادہ نہیں تھی ـــ پودے پیڑ ساکت جامد تھے۔ کسم کے سامنے گنگا کے سینے پر دور تک پھیلی ہوئی چاندنی کسم کے پیچھے، آس پاس، سہارے سہارے پیڑ پتّوں پر، مندر کی چھایائیں، ٹوٹے ہوئے مکانوں کے دیواروں کے پاس' ـــ تالاب کے کنارے، تاڑ کے درختوں کے نیچے، تاریکی جسم ڈھانپ کر منہ موڑے ہوئے بیٹھی تھی ـــ درختوں کی ڈال پر چمگادڑ جھول رہے تھے ـــ مندر کے کنارے بیٹھا ہوا اُلّو رو اٹھا، بستی کے نزدیک گیدڑوں کی بے ہنگم آواز اُبھری اور ڈوب گئی۔

سنیاسی آہستہ آہستہ مندر سے نکل کر باہر چلے آئے۔ گھاٹ پر آ، دو ایک سیڑھی اُتر، تنہائی میں ایک نوجوان لڑکی کو دیکھ کر لوٹ جانے کی سوچ رہے تھے ـــ اچانک اُسی وقت کسم نے مُنہ اُٹھا کر پیچھے کی طرف دیکھنا چاہا۔

اُس کی پیشانی سے آنچل سرک گیا۔ نوخیز کھولوں پر جس طرح چاندنی پڑ رہی تھی

مُنہ اُٹھاتے ہی کسم کے مُنہ پر اُسی طرح چاندنی پڑی۔ اُسی لمحہ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ جیسے جان پہچان ہو گئی۔ دل کرا ایسے لگا جیسے کہ پچھلے جنم کی جان پہچان ہو۔

سر کے اوپر سے اُلو چلاتا ہوا گذر گیا۔ اُس کی آواز سے چونک کر کسم نے ماتھے کے اوپر کپڑا ڈال لیا اور اُٹھ کر سنیاسی کے قدموں میں گر کر پرنام کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" سنیاسی نے آشیرواد دے کر استفسار کیا۔

"میرا نام کسم ہے۔" کسم نے کہا۔

اُس رات اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ کسم کا گھر نزدیک ہی تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلی گئی۔ اُسی رات سنیاسی بہت دیر تک میری سیڑھیوں پر بیٹھے رہے۔ بالآخر پورب کا چاند پچھم میں آ گیا۔ سنیاسی کا عقبی سایہ سامنے آ کر پڑنے لگا۔ اُسی وقت وہ اُٹھ کر مندر میں چلے گئے۔

اُس کے دوسرے دن سے میں دیکھنے لگا۔ کسم روزانہ آ کر سنیاسی کے قدموں کی خاک لے جاتی۔ سنیاسی جس وقت شاستروں کی دیاکھیا کرتے اُس وقت وہ ایک طرف کھڑی ہو کر غور سے سُنتی۔ سنیاسی روزانہ پوجا سے فارغ ہو کر کسم کو بُلا کر اُس سے دھرم کی باتیں کرتے۔ سب باتیں وہ کیا سمجھ پاتی۔ لیکن وہ چُپ چاپ غور سے سب کچھ سُنتی رہتی۔ سنیاسی اُسے جس طرح اپدیش دیتے وہ جوں کی توں اُن کا پالن کرتی۔ روزانہ وہ مندر کا کام کرتی۔ دیوسیوا میں سُستی نہ دکھاتی۔ پوجا کے پھول چُنتی اور گنگا جل لا کر مندر کو دھوتی۔

سنیاسی اُسے جتنی بھی باتیں بتا دیتے۔ میری سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ انہی

کو سوچتی ۔۔۔ آہستہ آہستہ اُس کے دماغ میں سب باتیں بیٹھتی گئیں۔ دل اور
دماغ کھل گیا۔ اُس نے جو دیکھا نہیں تھا ۔۔۔ اُسے دیکھنے لگی۔ جو سُنا نہیں
تھا سُننے لگی ۔۔۔ اُس کے شانت چہرے پر جو اُداسی کی گہری لکیریں تھیں
وہ دور ہو گئیں۔ وہ جب وقت بھگتی بھاؤ سے ملی انصیح سنیاسی کے قدموں کے
نزدیک لوٹ جاتی اُس وقت اُسے دیوتا پر چڑھائے ہوئے شبنم میں بھیگے
ہوئے پھولوں کی طرح دیکھا جاتا ۔۔۔ ایک سحر آفریں شگفتگی اُس کے تمام جسم میں
لہرانے لگی۔

موسم سرما کے آخیر میں خنک ہوا بہتی اور کبھی کسی دن شام کے وقت اچانک
ہی لسینی ہوا اُس میں آ ملتی ۔۔۔ آسمان میں اوس ختم ہو جاتی ۔۔۔ بہت دنوں بعد
گاؤں میں منیری بج اُٹھتی ۔۔۔ گیتوں کے الفاظ سُنائی دینے لگتے ۔۔۔ ملاح
ہوا میں کشتی ڈال کر، ڈانڈا سیدکر، کرشن کنہیا کے گیت گانے لگتے ۔۔۔ ایک
ڈال سے دوسری ڈال پر پھدکتے ہوئے پنچھی اچانک ہی خوشی کے مارے
پھڑپھڑانے لگتے ۔۔۔ اس طرح کا موسم آ گیا۔

موسم بہار کی ہوا لگنے سے میرے پتھر دل کے درمیان آہستہ آہستہ
گویا شباب اُمنڈنے لگا تھا ۔۔۔ اس وقت کسم کو میں پھر نہیں دیکھ پایا۔
کچھ دنوں سے وہ پھر مندر میں نہیں آئی ۔۔۔ گھاٹ پر بھی نہیں آئی۔ سنیاسی
کے پاس اُسے پھر نہیں دیکھا جاتا۔

اس بیچ کیا ہوا میں کچھ بھی نہیں جان سکا۔ کچھ عرصہ بعد ایک دن شام کے
وقت میری ہی سیڑھیوں پر سنیاسی کے درشن ہوئے۔

کسم نے منہ نیچا کر کے کہا ۔۔۔

"پربھو ۔۔۔ ! کیا مجھے بلایا تھا ۔۔۔ ؟

"ہاں —! تم غیر حاضر کیوں رہتی ہو —؟ آجکل دیو پوجا میں تم
اس قدر بے پرواہی کیوں برتتی ہو —؟"
کسم نے کچھ منہ پھیر کر کہا —
"پرکھو —! میں گنہگار ہوں اس لئے یہ بے پرواہی ہے —!"
"کسم —!" سنیاسی انتہائی پیار اور شفقت سے بولے —
"تمہارے دل میں اشانتی پیدا ہوئی ہے — میں اُسے سمجھ رہا ہوں —!"
کسم گویا چونک پڑی —— اُس نے دل میں سوچا — نہ جانے کیا
سوچ لیا ہے۔ اُس کی آنکھیں دھیرے دھیرے پانی سے بھر آئیں —
وہ اُسی جگہ بیٹھ گئی — منہ کو آنچل سے ڈھک کر سیڑھیوں پر سنیاسی کے
پاؤں کے پاس بیٹھ کر رونے لگی —
سنیاسی قدرے پرے سرکتے ہوئے کہا۔
"اپنی اشانتی کی بات مجھے اچھی طرح واضح کر کے بتاؤ — میں تمہیں
شانتی کا مارگ دکھاؤں گا —"
کسم نے بھگتی بھرے لہجہ میں کہا — لیکن بیچ بیچ میں رُکی ——
بیچ بیچ میں بات میں ہند ھ ڈاگئی —
"آپ نے حکم دیا ہے تو ضرور کہوں گی — پھر بھی میں اچھی طرح
نہیں کہہ پاؤں گی — لیکن آپ دل ہی دل میں شائد کچھ جانتے ہیں ——
ہے پرکھو —! میں ایک شخص کی دیوتا کی مانند پرستش کرتی ہوں — خوشی
سے میرا دل جھوم جھوم اُٹھا۔ میں اُس کی پوجا کرتی ہوں۔ لیکن ایک دن
رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے وہ میرے ہردے کے سوامی کہیں
جنگل کے تنہا گوشے میں بیٹھ کر اپنے بائیں ہاتھ میں میرے داہنے ہاتھ کو

ے کر مجھ سے پریم کی باتیں کر رہے ہیں — اس حرکت میں مجھے اتنی سی بھی بد اخلاقی، یا جبرت داستعجاب کا عنصر نظر نہیں آیا — خواب ٹوٹ گیا پھر بھی خواب کی نیند نہیں ٹوٹی۔ اس کے دوسرے دن جب انہیں دیکھا۔ پھر پہلے کی طرح نہیں دیکھ پائی۔ دل میں اس خواب سے نقوش ابھرنے لگے۔ خوف دور بھاگ گیا لیکن وہ تصویر میرے ساتھ ہی ساتھ رہی۔ اس وقت سے میرے دل کی اشانتی دور نہیں ہوئی۔ مجھے چہار سو تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگی۔"

جس وقت کسم آنسو بہا کر ان باتوں کو کہہ رہی تھی اس وقت میں محسوس کر رہا تھا کہ سنیاسی نے پوری طاقت لگا کر اپنے پاؤں کے پنجے سے میرے پنجہ کو دبا رکھا ہے۔

کسم کی بات ختم ہونے پر سنیاسی بولے —

"جسے خواب میں دیکھا ہے اسے کیا کہا جائے گا —؟"

کسم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اسے نہیں بتا سکوں گی —؟"

"تمہارے کلیان کیلئے ہی پوچھ رہا ہوں —" سنیاسی نے کہا —

"وہ کون ہے۔ صاف صاف کہو —"

کسم اپنی پوری طاقت سے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑتی ہوئی بولی —

"وہ کون ہے — ؟ کیا ضرور بتانا ہوگا —؟"

"ہاں بتانا ہی ہوگا —!" سنیاسی نے جواب دیا۔

"پر بھو — ! وہ تم ہو —" کسم کی کانپتی ہوئی آواز ابھری۔

جوں ہی اُس کی آواز اُس کے اپنے کانوں سے ٹکرائی۔ اُسی وقت وہ بیہوشا کر میرے سخت آغوش میں گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ سنیاسی پتھر کی مورتی کی مانند کھڑے رہے۔

جس وقت بے ہوشی ختم ہونے کے بعد کسم اٹھ کر بیٹھی اُس وقت سنیاسی نے آہستہ کہا۔

"تم نے میری ساری باتیں مانی ہیں۔ ایک اور بات کہوں گا وہ بھی ماننا ہو گی ــــ میں آج ہی یہاں سے جا رہا ہوں، مجھ سے آئندہ تمہاری ملاقات نہیں ہو گی۔ تمہیں مجھے بھول جانا ہو گا۔ بولو یہ وعدہ کرو گی ــــ؟"

کسم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سنیاسی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"پربھو ــــ! ایسا ہی ہو گا ــــ!!"

"تو میں جا رہا ہوں ــــ!!" سنیاسی نے کہا۔

کسم نے اور کچھ نہ کہہ کر اُنہیں پرنام کیا اور اُن کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگا لی۔

سنیاسی چلے گئے۔

کسم نے کہا۔

"وہ حکم دے گئے ہیں اُنہیں بھولنا ہی ہو گا۔"

اور یہ کہہ کر وہ دھیرے دھیرے گنگا کے پانی میں اُتر گئی۔

اب تک کا وقت اُس نے پانی میں بتایا ہے۔ ایسے وقت میں پانی اگر بڑھ کر اُسے اپنی آغوش میں نہ لے گا تو اور کون لے گا ــــ؟

چاند ڈوب گیا ــــ رات گہری، تاریک ہو گئی ــــ پانی کی آواز اُبھری اور کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا ــــ اندھیرے میں ہوا ہو ہو کرنے لگی ــــ بعد میں تل بھر بھی کچھ نہ دیکھا جا سکا ــــ کہ یہ سوچ کر اس نے گویا پھونک مار کر نہان کے تارِ دل کو بھی بجھا دینا چاہا۔

میری گود میں جو کھیلا کرتی تھی، وہی آج اپنا کھیل ختم کر کے میری گود میں سے کہاں سرک گئی ــــ نہیں جان پایا ہوں ــــ!!!

●○

چھُٹّی

لڑکوں کے سردار پاٹھک چکرورتی کے دماغ میں یکبارگی ایک نئی لہر دوڑ گئی — ندی کے کنارے ایک بہت بڑا لکڑی کا ٹکڑا مستول بنانے کے انتظار میں پڑا تھا۔ یہ طے ہوا کہ اُسے سب لڑکے مل کر لڑھکا کر لے چلیں۔

جس آدمی کی لکڑی ہے ضرورت کے وقت اُسے کس قدر حیرانی اور پریشانی ہوگی — اس بات کا خیال کر کے سب لڑکوں نے اس تجویز کی اتفاقِ رائے سے تائید کی۔

کمر باندھ کر سبھی لوگ جب اس کام کے کرنے کو تیار ہو رہے تھے — تو پاٹھک کا سب سے چھوٹا بھائی مکھن لال بڑی سنجیدگی سے اُس لٹھے پر جا کر بیٹھ گیا — لڑکے اُسے اس قدر پریشان اور اُداس دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔

ایک نے آ کر ڈرتے ڈرتے اُسے ذرا سے دھکیلا بھی۔ لیکن وہ

ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ لڑکوں کے اس کھیل کے بارے میں سوچ وچار کرتا رہا۔

پاٹھک نے آکر رعب جتا کر گھڑکی لگائی۔

"دشمن ——! مار کھا جائے گا —— ورنہ اُٹھ جا جھٹ پٹ ——!!"

اس پر وہ اور بھی جسم کو احتیاط کے ساتھ اس لکڑی کے لٹھے پر بیٹھ گیا۔ ایسی حالت میں سب لوگوں کے سامنے اپنی لیڈری کی لاج رکھنے کے لئے پاٹھک چکرورتی کا فرض تھا۔ کہ وہ اپنے ڈھیٹ بھائی کے گال پر ایک چپت جڑ دے —— لیکن اُسے ہمت نہ ہوئی —— پھر اُس نے ایسا منہ بنایا گویا وہ چاہے تو اُسے ابھی درست کر سکتا ہے —— لیکن کرے گا نہیں۔ کیونکہ پہلے سے بھی دلچسپ کھیل اُس کے دماغ میں آیا ہے —— اور وہ زیادہ مزے دار کھیل ہے۔ اُس نے تجویز رکھی کہ مکھن لال کے ساتھ ہی اس لکڑی کے لٹھے کو لڑھکایا جائے۔

مکھن نے سوچا کہ اُس میں اُس کی بڑائی ہے۔ لیکن ایسی دیگر بڑائیوں کی طرح اُس بڑائی میں بھی اُسے کس قدر پریشانی اُٹھانی پڑے گی۔ اس بات کا اس نے احساس بھی نہ کیا۔

لڑکوں نے لکڑی کے لٹھے کو کمر کس کر لڑھکانا شروع کیا۔

"لگا دو دھکا ——! ہو —— ہو —— ہو!!! —— شاباش جوانو! ہو —— ہو —— ہو!!!"

لٹھا ایک جگہ گھوم نہ پایا تھا کہ مکھن اپنے تمام غرور، فخر اور بڑائی کے ساتھ تیورا کر زمین پر آ رہا۔

کھیل کی ابتدا میں ہی اس قدر حوصلہ افزا نتیجہ کا احساس کر کے لڑکے

کھکھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن پاٹھک کچھ بگڑ گیا ۔۔۔ مکھن جھٹ پٹ زمین پر سے اُٹھ کر پاٹھک پر ٹوٹ پڑا اور اندھے کی طرح بے تحاشہ مارنے لگا۔۔ اُسکی ناک مُنہ نوچ کھسوٹ کر روتے روتے گھر کی طرف چلا گیا۔

کھیل بکھیڑ گیا ۔۔۔ ...

جَید کا نس اُٹھا کر اُسے ہاتھ میں لئے ایک ادھ ڈوبی کشتی کے کنارے پر جا کر پاٹھک بیٹھ گیا ۔۔ اور چُپ چاپ بیٹھا بیٹھا کانس کی جڑ چبانے لگا۔

اتنے میں ایک پردیسی ناؤ آ کر گھاٹ پر لگی۔ اُس میں سے کھچڑی مونچھیں اور پکے ہوئے بال لئے ایک ادھیڑ عمر شخص نیچے اُترا۔ اُس شخص نے پاٹھک سے پوچھا۔

"چکرورتی کا گھر کہاں ہے بیٹا ۔۔!"

"اُس طرف ۔۔۔ !" لڑکے نے کانس چباتے ہوئے کہا ۔۔ لیکن اُس نے کس طرف اشارہ کیا ۔۔ یہ کوئی نہ سمجھ سکا۔

اُس بزرگ نے پوچھا۔

"کدھر ۔۔۔ ؟"

اُس نے کہا ۔۔۔ "معلوم نہیں ۔۔۔ ؟" اتنا کہہ کر وہ حسب سابق گھاس کی جڑ سے رس نکالنے لگا ۔۔۔ وہ بزرگوار تب دوسروں سے پوچھ تاچھ کر چکرورتی کے گھر کی تلاش میں چل دئے۔

تھوڑی دیر میں باگھا نے آ کر کہا ۔۔ "پاٹھک بھیّا ! ماں جی بُلا رہی ہیں"

"نہیں جاؤں گا ۔۔۔ !" پاٹھک نے کہا۔

باگھا نے اُسے زبردستی گود میں اُٹھا لیا اور پاٹھک جھنجھلا کر اُس کی گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

پاٹھک کو دیکھتے ہی ماں آگ بگولہ ہو گئی۔ بولی۔

"پھر تو نے مکھن کو مارا ہے ۔۔؟"

"نہیں ۔۔۔ ! میں نے نہیں مارا ہے ۔۔ !!" پاٹھک نے کہا۔

"جھوٹ بکتا ہے ۔۔ !"

"کبھی نہیں مارا ۔۔۔ مکھن سے پوچھ لو ۔۔ !!"

مکھن سے پوچھتے ہی اُس نے شکایت کو دوہراتے ہوئے کہا

"ہاں مارا ہے ۔۔۔ !"

اب پاٹھک سے برداشت نہ ہو سکا۔ تیزی سے لپک کر اُس نے پاٹھک کے گال پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ اور کہا۔

"پھر جھوٹ ۔۔ !!"

ماں نے مکھن کو حمایت لے کر پاٹھک کو زور سے جھنجوڑ ڈالا۔ اور اُس کی پیٹھ پر دو تین تھپڑ لگا دیے۔

پاٹھک نے ماں کو دھکیل دیا۔

"ارے ۔۔ ! تو مجھ پر بھی ہاتھ اُٹھاتا ہے ۔۔۔ !!"

عین اُسی وقت وہ بزرگوار اندر آ کر بولے۔

"کیا ہو رہا ہے تم لوگوں میں ۔۔۔ ؟"

پاٹھک کی ماں کے چہرے پر حیرت و استعجاب اور خوشی کی لکیریں لہرانے لگیں ۔۔۔ بے اختیار وہ بولی۔

"ارے ۔۔ ! یہ تو دادا آ گئے ۔۔ کب آئے دادا ۔۔ ؟" کہہ کر اُنہوں نے بھائی کو پرنام کیا۔

بہت دن ہوئے دادا نوکری کرنے دور دیس گئے تھے۔ اس دوران میں پاٹھک کی ماں کے دو بچے ہوئے تھے۔ وہ بچے کافی بڑے ہو گئے تھے۔ اُن کے پتی کا سورگباش ہو گیا تھا۔ لیکن دادا ایک بار بھی اپنی بہن سے ملنے نہیں آئے۔ آج بہت دن بعد چھٹی پاکر دشمبر بابو اپنی بہن سے ملنے آئے ہیں۔

کچھ دن بڑی ہنسی سے خوشی سے بیتے۔ آخر میں رخصت ہونے سے دو ایک دن پہلے دشمبر بابو نے اپنی بہن سے بچوں کی پڑھائی لکھائی اور اُن کی پرورش اور پرداخت کے بارے میں پوچھا۔ جواب میں اُنہیں سننے کو ملا۔ پاٹھک کہنا نہیں مانتا۔ شریر اور شیطان ہے۔ پڑھنے کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ اور مکھن شریف اور نیک ہے اور پڑھنے میں بھی تیز ہے۔

اُن کی بہن نے کہا۔

"پاٹھک کے مارے تنگ آ گئی ہوں۔!"

یہ سُن کر دشمبر بابو نے تجویز رکھی کہ وہ پاٹھک کو کلکتہ لے جائیں گے اور اپنے ساتھ رکھ کر اُس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں گے۔ بیوہ اس تجویز پر فوراً ہی رضامند ہو گئی۔

اُنہوں نے پاٹھک سے پوچھا۔

"کیوں رے پاٹھک۔! ماما کے ساتھ کلکتہ جائے گا۔!"

"جاؤں گا۔!!" پاٹھک نے اُچھل کر کہا۔

حالانکہ پاٹھک کو کلکتہ بھیجنے میں اُس کی ماں کو کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ اُسے خطرہ رہتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی دن مکھن کو پانی میں ڈھکیل دیگا۔ یا سر پھوڑ دیگا لیکن اس کے باوجود پاٹھک کا اصرار دیکھ کر اُس کا دل بھر آیا۔

آخیر میں روانہ ہوتے وقت جوشِ مسرت سے بیتاب ہو کر اپنی مینی، پتنگ، اور چرخی مکھن کو پُشت در پُشت استعمال کرنے کا حق دیتے ہوئے سونپ گیا۔
کلکتہ میں ننھیال پہونچ کر سب سے پہلے مامی سے ملاقات ہوئی۔ اپنے پریوار میں ایک ممبر بڑھ جانے سے مامی کو خوشی ہوئی تھی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا۔
وہ اپنے تین لڑکوں کے ساتھ اپنی گرہستی حسب منشا چلا رہی تھی۔ اچانک ہی اُن کے درمیان ایک تیرہ سال کے نامحرم اور غیر تربیت یافتہ دیہاتی لڑکے کو چھوڑ دینے سے قدرے کشاکشی کی سی حالت ہو جاتی ہے مگر ہیں۔ ۔ وہ تمبر کی عمر اتنی ہو چکی ہے۔۔۔ لیکن اُس کے باوجود انہیں اتنی سی بھی عقل نہ آئی۔
خاص طور پر تیرہ چودہ سال کے لڑکے کے برابر دُنیا میں اور کوئی بلا نہیں ہے نہ تو وہ گھر کی رونق ہے اور نہ ہی وہ گھر کے کسی کام آتا ہے نہ تو اُسے دیکھ کر پیار ہی اُمنڈتا ہے۔ نہ ہی اُس کی محبت سے کسی کو خوشی ہوتی ہے۔ اُس کے مُنہ سے معصومیت بھری، توتلی باتیں سُن کر لوگ یہ سمجھیں گے کہ وہ بن رہا ہے۔ صاف صاف باتیں کرنے لگے تو خیال کریں گے کہ وہ بزرگوں کی نقل اُتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس کا اس طرح باتیں کرنا ڈھٹائی ہے۔ اپنے لباس کا خیال کر کے بڑی تیزی کے ساتھ قد کا بڑھنا بھی لوگوں کی نظر میں بہت اکھرتا ہے۔ اُس کے بچپن کی نزاکت و معصومیت از لب و لہجہ کی مٹھاس اگر قائم نہیں رہتی ہے تو لوگ اُس کے لئے اُس کو قصوروار ٹھہرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بچپن اور جوانی کے بہت سے قصور معاف کیئے جا سکتے ہیں لیکن اس عمر کا کوئی معمولی کٹھ فد گذر کئے جانے والا قصور بھی ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا ہے۔
اور وہ خود بھی دل میں ایسا ہی سمجھنے لگتا ہے کہ دُنیا میں کہیں پر بھی اُس کے لئے مناسب جگہ نہیں ہے۔ اور وہ اسی وجہ سے اپنے وجود کے بارے میں

ہمیشہ تصور وار بنا رہتا ہے۔ حالانکہ اس عمر میں پیار و شفقت حاصل کرنے کیلئے دل میں بہت زیادہ بے تابی و بے قراری رہتی ہے۔ اس وقت اگر وہ کسی نرم دل شخص کے پیار کے دو بول سن لیتا ہے تو...... تو ایک طرح سے وہ اس کے ہاتھ بک سا جاتا ہے۔ لیکن اس سے کوئی لاڈ پیار کرنے کی ہمت بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ عام لوگوں کی نگاہوں میں وہ سر چڑھانے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اس لیئے اس کا رنگ روپ اور آداب و انداز وغیرہ ایک لاوارث آوارہ کتے جیسا ہو جاتا ہے۔

اس لیئے ایسی حالت میں ماں کے گھر کے علاوہ ان جان جگہ بچے کے لیئے نرک کے برابر ہوتی ہے — چاروں طرف نفرت، حقارت اور ناپسندیدگی اس کی راہ میں کانٹے بچھائے رہتی ہے عام طور پر اس عمر میں عورتیں انتہائی عجیب و غریب پیار اور بیراگ کی مورتی سی محسوس ہوتی ہے۔ اس لیئے عورتوں کی طرف سے مخالفت کا ہونا اس کیلئے نہایت ناقابل برداشت ہو جاتا ہے —!

پاٹھک کو یہ بات سب سے زیادہ اکھرنے لگی کہ وہ مامی کی پیار سے خالی آنکھوں میں اکھرنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی اگر مامی اُسے کسی کام کیلئے کہتی تو وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا اور خوشی کے مارے وہ ضرورت سے زیادہ کام کر ڈالتا۔ آخر میں جب مامی اس کے جوش و خروش کو کچلتی ہوئی کہتی —

"بس اب رہنے دو — ! کافی ہو گیا ہے۔ اب جا کر اپنے کام میں دھیان دو — جاؤ جا کر پڑھو لکھو — !!!" تب اُسے اپنے ذہنی ارتقا کے تئیں مامی کا اس قدر زیادہ خیال انتہائی ناقابل برداشت نا انصافی سی محسوس ہونے لگتا —

گھر میں اس قدر بے عزتی تھی اور باہر کھلی سانس لینے کی کوئی جگہ نہ تھی

چاروں طرف ... ویرانوں سے گھرے رہتے رہتے اُسے بار بار صرف اپنا گاؤں ہی یاد آنے لگتا۔

بہت بڑی پتنگ کو اڑانے کیلئے وہ بہت بڑا سا میدان ــــ اپنے بنائے ہوئے بے مقصد اور بے معنی گیت کو دل چاہے راگ میں الاپتے ہوئے بے کار کھیٹ کنے کیلئے وہ ندی کا کنارہ ــ دن میں جب جی میں آیا تب کود کر تیرنے کیلئے وہ ندی ــ اپنا وہ لڑکوں کا گروہ ــ اُدھم اور آزادی، سب کچھ اُسے یاد آتے تھے ــ لیکن سب سے زیادہ درد بے درد ــ ظالم ماں! اُس کے بے بس دل کو دن رات اپنی ہی طرف متوجہ کرتی رہتی تھی۔

سکول میں اتنا کند ذہن اور پڑھنے لکھنے سے جی چرانے والا لڑکا دوسرا کوئی بھی نہیں تھا ــ کوئی بھی بات پوچھنے پر وہ منہ بنائے کھڑا رہتا تھا ماسٹر جب مارنا شروع کرتے تو وہ بوجھ سے لدے تھکے گدھے کی طرح چپ چاپ سب سہہ لیتا ــ لڑکوں کو جب کھیلنے کی چھٹی ملتی تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا کھڑا دور کے مکانوں کی چھتوں کو دیکھا کرتا تھا ــ جب دوپہر کو اُس دھوپ میں کسی مکان کی چھت پر دو ایک لڑکے لڑکیاں کھیل کے بہانے دکھائی پڑ جاتے تو اُس کا دل بے چین ہو اٹھتا تھا۔

ایک دن اُس نے دل میں پختہ کر بڑی ہمت کر کے ماما سے پوچھا ــ

"ماما ــ ! ماں کے پاس کب جاؤں گا؟"

ماما نے کہا ــ

"سکول میں چھٹی ہونے دو ــ اکتوبر میں دُرگا پوجا کی چھٹی ہو گی ــ ابھی تو بہت دن ہیں ــ !"

ایک دن پاٹھک کے سکول کی کتابیں کھو گئیں ۔ ایک تو یوں ہی سبق یاد نہیں ہوتا تھا اُس پر کتابیں کھو کر تو وہ ایک دم بے یار و مددگار سا ہو گیا۔ ماسٹر صاحب اور بھی دھڑلے سے اُسے مارنے پیٹنے اور اُس کی بے عزتی کرنے لگے ۔ سکول میں اُس کی اس قدر بُری حالت ہوئی کہ اُس کے ماموں زاد بھائی بھی اُس کے ساتھ رشتہ داری ظاہر کرنے میں ہچکچانے لگے اور شرمندگی محسوس کرنے لگے۔ پاٹھک کی کسی بھی بے عزتی پر وہ دوسرے لڑکوں سے زیادہ دکھا دکھا کر اپنی خوشی ظاہر کرنے لگے۔

جب اُس سے مزید برداشت نہ ہو سکا تو ایک دن مجرم کی مانند اپنی مامی کے پاس جا کر کہنے لگا۔

"میری کتابیں کھو گئی ہیں ۔۔۔!"

مامی نے ہونٹوں کے کونوں پر غصے کی لکیریں بکھیرتے ہوئے کہا ۔

"بہت اچھا کیا ۔۔۔ مگر میں مہینے میں پانچ پانچ بار تمہارے لئے کتابیں نہیں خرید واسکتیں ۔"

پاٹھک بغیر کچھ کہے چُپ چاپ لوٹ آیا ۔ وہ دوسروں کے روپے برباد کر رہا ہے ۔ یہ خیال کر کے اُسے اپنی ماں پر غصہ آنے لگا ۔ اپنی بے چارگی اور کم مائیگی کا احساس کر کے وہ زمین میں گڑ سا گیا۔

سکول سے لوٹنے پر اُس دن رات کو اُس کا سر دُکھنے لگا اور بدن کانپنے لگا ۔ وہ سمجھ گیا کہ اُسے بخار چڑھ رہا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ بیمار ہونے کے بعد مامی کیلئے وہ پریشانی کا باعث ہو جائے گا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ مامی کس طرح اس بیماری کو غیر ضروری اور ناقابل برداشت ہنگامے کی شکل دے دے گی ۔ بیماری کے وقت ایسے نکمے، بدھو بچے کو دُنیا بھر

اپنی ماں کے علاوہ کسی اور سے خدمت حاصل ہو سکتی ہے یہ سوچتے ہوئے بھی شرم آنے لگی۔

اگلے دن پاٹھک کہیں دکھائی نہ دیا۔ چاروں طرف پڑوسیوں کے گھروں کو ڈھونڈا۔ لیکن اُس کا کہیں پتہ نہ لگا۔

اُس دن رات سے ہی برسات کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اسلئے اُسے تلاش کرنے میں لوگوں کو ناحق بھیگنا پڑا۔ آخر میں جب اُس کا کہیں پتہ نہ چلا تو وشمبر بابو نے تھانے میں رپورٹ کر دی۔

دن بھر کی تلاش کے بعد شام کو ایک گاڑی وشمبر بابو کے مکان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اُس وقت بھی لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ اور سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی بھرا ہوا تھا۔

پولیس کے سپاہیوں نے مل کر پاٹھک کو اُتارا اور وشمبر بابو کے پاس پہونچا دیا۔ اس کا تمام جسم بھیگا ہوا اور کیچڑ میں لت پت تھا۔ منہ اور آنکھیں لال لال ہو گئی تھیں۔ اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وشمبر بابو اُسے گود میں اُٹھا کر اندر لے گئے۔

نامی اُسے دیکھتے ہی بول پڑی۔

"کیوں جی! پرائے لڑکے کیلئے کیوں جان آفت میں ڈالے ہوئے ہو اسے اس کے گھر کیوں نہیں بھیج دیتے ــــ؟"

درحقیقت اس فکر میں اُنہوں نے دن بھر کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اور اپنے لڑکوں پر بھی ناحق کافی غصہ اُتار چکی تھیں۔

پاٹھک رو پڑا اور بولا ــ

"میں تو ماں کے پاس جا رہا تھا ــ یہی لوگ مجھے لوٹا لائے ہیں ــــ!"

لڑکے کو بخار کافی تیز ہو گیا۔۔۔ رات بھر وہ آئیں بائیں بکتا رہا۔۔۔
دشمبر بابو ڈاکٹر لے آئے۔۔۔!
پاٹھک نے اپنی لال لال آنکھیں کھول کر اوپر چھت کی طرف سونی نگاہوں سے دیکھا۔ اور کہا۔۔
"ماماجی۔۔۔! میری چھٹی ہو گئی ہے کیا۔۔۔؟"
دشمبر بابو نے رومال سے آنسو پونچھے۔۔۔ اس کے بعد پاٹھک کے جلتے ہوئے دُبلے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے اُس کے پاس بیٹھے رہے۔۔
پاٹھک بڑبڑانے لگا۔
"ماں۔۔۔! مجھے مت مار ماں۔۔۔!! سچ بتا رہا ہوں کہ میں نے کچھ نہیں کیا ہے ماں!!"
دوسرے دن کچھ دیر کیلئے ہوش میں آکر پاٹھک کسی کی اُمید میں کمرے میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔۔۔ نااُمید ہو کر دیوار کی طرف کروٹ بدل کر چپ چاپ لیٹ گیا۔
دشمبر بابو نے اُس کے دل کی بات تاڑ لی۔۔۔ اور اُس کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر مدھم آواز میں کہا۔۔
"پاٹھک۔۔۔! تیری ماں کو بُلایا ہے بیٹا۔۔۔!"
اس کے بعد ایک دن اور گذر گیا۔ ڈاکٹر نے اُداس اور فکرمندانہ لہجہ میں کہا کہ حالت بہت خراب ہے۔۔۔!
دشمبر بابو ٹمٹماتی ہوئی بتی کی روشنی میں مریض کے سرہانے بیٹھ کر پاٹھک کی ماں کیلئے ہر لمحہ انتظار کرتے رہے۔
پاٹھک جہاز کے ملاحوں کی طرح انہی کے لہجہ میں کہنے لگا۔۔

"ایک باؤں ملا نہیں ــــ دو باؤں ملا نہیں ــــ ......!" کلکتہ آنے وقت کچھ راستہ اُسے سٹیمر میں آنا پڑا تھا۔ اس اسٹیمر کے ملّاح رسّی ڈال کر گانے کے انداز میں پانی کی گہرائی ناپتے تھے ــــ پاٹھک بھی اپنی بڑبڑاہٹ کے جھونکے میں اُنہی کے لب و لہجہ میں نقل کرتا ہوا کربناک آواز میں گویا پانی کی گہرائی ناپ رہا تھا ــــ جس بحرِ ناپیدا کنار میں وہ معصوم بچہ سفر کر رہا تھا ــــ وہاں کہیں پر بھی رسّی ڈال کر اُسے اُس کی تھاہ نہیں مل رہی تھی۔

"عین اسی وقت پاٹھک کی ماں آندھی کی طرح کمرے میں آ پہنچی ــــ اور زار و قطار رونے لگی ــــ دشمبر نے بڑی مشکل سے بہن کو چپ کرایا تو وہ اپنے پاٹھک کے بستر پر پچھاڑ کھا کر گر پڑی اور زور زور سے پکارنے لگی۔

"پھاٹک ــــ! میرا لال ــــ! میرا منّا ــــ! ــ میرا بیٹا ــــ!!"

پاٹھک کچھ نہ بولا تو ماں نے کہا ــــ

"ارے میرے پاٹھک رے ــــ میرے بچوا رے ــــ!!"

پاٹھک نے دھیرے سے کروٹ لی ــــ اور کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مدھم اور گمبھیر لہجہ میں بولا ــــ

"ماں ــــ! اب میری چھٹی ہو گئی ماں ــــ!! اب میں گھر جا رہا ہوں ــــ ماں!!!"

●●

اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ میں دُرگا پوجا کی چھٹیوں میں کلکتہ رہا تھا ___ ریل گاڑی میں اُس بابو سے ملاقات ہو گئی۔ اُس کا لباس دیکھ کر میرے خیال پیدا ہو گیا تھا کہ وہ پسماندہ مسلمان ہے۔ اُس کی بات چیت سُن کر اور بھی اُلجھن میں پڑ گیا۔ دُنیا کے ہر معاملہ میں وہ اس ڈھنگ سے باتیں کرنے لگا ___ گویا اسی سے صلاح مشورہ کر کے خالقِ دو جہاں ہر کام کیا کرتا ہے ___ تمام دُنیا میں عجیب و غریب واقعات و حادثات وقوع پذیر ہو رہے تھے ___ روس اتنا آگے بڑھ گیا ہے ___ ہندوستانی راجاؤں میں کھچڑی سی پک رہی ہے ___ ان سبھی باتوں کے بارے میں کچھ بھی نہ جان کر ہم لوگ نہایت سکون و اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے ___ ہمارے اُس دوست نے مسکرا کر کہا ___

”جنت اور زمین پر صرف اسی قدر واقعات و حادثات ہی وقوع پذیر نہیں ہوتے جتنے اخباروں میں شائع ہوتے ہیں ___ اُن کی تعداد

کہیں زیادہ ہوتی ہے ــــ !!"

ہم لوگ پہلی بار گھر چھوڑ کر باہر نکلے تھے۔ اس لئے اُس آدمی کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر دنگ رہ گئے ــــ معمولی معمولی باتوں کے سلسلہ میں وہ سائنس کی باتیں کرتا۔ کبھی ویدوں کی ویاکھیا کرنے لگتا ــــ اور کبھی وہ فارسی کے شعر کہنے لگتا۔ سائنس، شعر و شاعری اور ویدوں میں ہم لوگوں کو کوئی دخل نہیں تھا ــــ اس لئے اس کے تئیں ہماری عقیدت بڑھتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ ہمارے ادھیا تمک رشتہ دار کے دل میں یہ پختہ یقین ہو گیا ــــ کہ ہمارا یہ ہمسفر کسی عظیم روحانی قوت کا مالک ہے ــــ وہ اس معمولی شخص کی ساری معمولی باتیں انتہائی توجہ سے سُن رہے تھے۔ اور چھُپ کر اُسے کاغذ پر نوٹ بھی کرتے جا رہے تھے ــــ اُس عجیب و غریب شخص کے طور طریقے سے مجھ پر یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ وہ بھی ہماری باتوں کو تاڑ گیا ہے اور دل ہی دل میں خوش ہے ــــ

گاڑی جب کٹنی پر آ کر رُکی تو ہم لوگ اُتر کر دوسری گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ روم میں اکٹھے ہوئے۔ اُس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ پتہ چلا کہ راستہ میں کوئی گڑبڑ ہو جانے کی وجہ سے گاڑی کافی دیر سے آئے گی ــــ اس دوران میز پر بستر بچھا کر میں نے سونے کا انتظام کر لیا تھا ــــ اتنے میں اس غیر معمولی شخص نے مندرجہ ذیل قصہ سُنانا شروع کر دیا ــــ اُس رات مجھے کچھ نیند نہیں آئی ــــ

"...... سرکاری کاموں سے متعلق دو ایک باتوں پر جب اختلاف پیدا ہو گیا تو میں نے جونا گڑھ کی نوکری چھوڑ کر حیدر آباد کی سرکار میں

آ گیا۔ مجھے نوجوان اور تندرست دیکھ کر اُن لوگوں نے پہلے پہل مجھے ردی کا سرکاری ٹیکس وصول کرنے کیلئے بھرڑوچ بھیج دیا۔

بھرڑوچ انتہائی دلفریب جگہ ہے ___ سنگلاخ پہاڑوں کے نیچے بڑے بڑے جنگلوں میں سے ہو کر دریا۔ بلوریں پتھروں کے ٹکڑوں سے ہم آغوش ہوتا، پگ پگ پر بل کھاتا، اُتار چڑھاؤ ہوتا ہوا، رواں دواں رقص کرتا ہوا چلا گیا ہے۔ اس دریا کے کنارے پر پتھر سے بنے ڈیڑھ سو سیڑھیوں والے گھاٹ پر ایک سفید سنگ مرمر کا محل آسمان کے قدموں کے پاس تنہا کھڑا ہے۔ آس پاس کوئی بستی نہیں۔ بھرڑوچ کی ردی کی منڈی اور گاؤں یہاں سے بہت دور ہیں۔

تقریباً ڈھائی سو سال پہلے شاہ محمود دوم نے عیش و عشرت کے لمحات گزارنے کیلئے اس تنہا اور پرسکون جگہ پہ یہ محل تعمیر کرایا تھا۔ اُس وقت محل کے غسل کے خاص فواروں سے گلاب اور عرق کی دھاریں نکلتی تھیں۔ اور غسل سے پہلے نوجوان اور حسین ...... ایرانی دوشیزائیں گلاب کے عرق میں مرمریں پاؤں لٹکائے رباب پر سحر آفریں اور رومان پرور نغمہ چھیڑا کرتی تھیں۔

اب نہ تو فوارے چلتے ہیں اور نہ وہ نغمے اُبھرتے نظر آتے ہیں اور نہ ہی سفید پتھروں پر مرمریں قدموں کی چاپ ہی پڑتی ہے۔ اب وہ محل ہم جیسے تنہائیوں کے ستائے ہوئے محصول کلکٹروں کیلئے بہت ہی بڑی اور بہت ہی سنسان آماجگاہ ہے۔ لیکن دفتر میں بوڑھے منشی کریم خاں نے مجھے اس محل میں رہنے کے بارے میں منع کیا تھا۔ کہا تھا۔ "جی چاہے تو دن میں بھلے ہی رہیے۔ لیکن رات ہرگز وہاں نہ گزاریئے گا!" میں نے یہ بات ہنس کر اُڑا دی۔ نوکروں نے کہہ دیا کہ وہ شام تک کام کریں گے لیکن رات کو یہاں ہرگز نہیں رہیں گے۔

"...کہا ... "...بات ہے"

دراصل یہ مکان اس قدر بدنام تھا کہ چور بھی یہاں آنے کی ہمت نہیں کرتے تھے پہلے پہل جب میں یہاں آیا تھا تو اس عظیم الشان، سنسان اور سنگلاخ عمارت کو دیکھ کر دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوتا تھا۔ مجھ سے جس قدر ممکن ہوتا میں باہر ہی رہتا ــــ اور کام کی تھکان سے چور چور ہو گھر لوٹ کر سو جاتا ہے ــــ

لیکن ایک ہفتہ بھر بعد ہی اس محل کے ایک انوکھے نشہ نے مجھے آہستہ آہستہ دھر دبایا۔ اپنی اس حالت کو بیان کرنا بھی مشکل ہے اور اس بات پر کسی کو یقین دلانا بھی مشکل ہے ــــ یہ سارا محل گویا مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ کر میری روح کو قبض کر لینا چاہتا تھا۔

شاید اس مکان میں قدم رکھتے ہی مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن جس روز بہ ہوش وحواس میں نے اس کی شروعات کو محسوس کیا۔ اُس دن کی باتیں مجھے صاف صاف یاد نہیں۔

ان دنوں گرمیاں شروع ہی ہوئی تھیں اور روئی کا بازار مندا تھا۔ میرے ہاتھ میں کوئی کام بھی نہیں تھا۔ غروب آفتاب سے قبل میں دریا کے کنارے اُس گھاٹ کے نیچے ایک آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ دریا کا پانی قدرے خشک ہو گیا تھا۔ اُس پار کا دور تک پھیلا ہوا کنارا ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں رنگین نظر آنے لگا تھا۔ اس پار گھاٹ کی سیڑھیوں کے نیچے صاف وشفاف پانی میں پتھر کے چھوٹے چھوٹے گول مٹول ٹکڑے چمک رہے تھے۔ اُس دن کہیں بھی ذرا سی ہوا نہ تھی ــ نزدیکی پہاڑ سے جنگلی تلسی اور پودینہ اور سولف کی جھاڑیوں سے اُڑتی ہوئی تیز طرار خوشبو نے پُرسکون اور خاموش آسمان کو بھاری کر دیا تھا۔

سورج جب افق کی گہرائیوں میں ڈوب گیا ــ تو یکبارگی گہری تاریکیوں نے سب چیزوں کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ یہاں درمیان میں پہاڑ آ جانے سے روشنی اور تاریکی کا

ملن مستقل نہیں ہوتا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں گھوم آنے کے خیال کرکے میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ اُسی وقت سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی ـــــ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا ـــ کوئی نہیں تھا۔

شاید میرا وہم ہے ـــ ! یہ سوچ کر میں مڑ کر بیٹھا ـــ اس مرتبہ بہت سے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ گویا بہت سے لوگ اُچھلتے کودتے اُترتے آرہے ہوں خوف وہراس کی وجہ سے میرے تمام جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ حالانکہ میرے سامنے کوئی بھی شخص نہ تھا ـــ اس کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہوا گویا گرمیوں کی اس شام میں نوخیز اور نوجوان دوشیزائیں دریا کے پانی میں نہانے اُتری ہیں ـــ اگرچہ اس شام کو ساکت وصامت پہاڑ کے نیچے، دریا کے کنارے ویران محل میں کہیں کوئی آواز نہیں آرہی تھی ـــ پھر بھی مجھے صاف سُنائی دیا کہ جھرنے کی لاتعداد دھاروں کی مانند کلیلیں کرتی ہوئی، ایک دوسری کو پیچھے چھوڑتی ہوئی نہاتی ہوئی دوشیزائیں میرے پاس سے نکل گئی ہیں۔ اُنہوں نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ جس طرح وہ مجھے نظر آرہی تھیں، شاید میں بھی اُن کی نظروں سے اوجھل تھا ـــ دریا پہلے کی طرح خاموش اور ساکن تھا ـــ لیکن مجھے صاف محسوس ہونے لگا کہ صاف وشفاف اور ساکن پانی بہت سی مرمریں اور گداز باہوں سے ہم آغوش ہے ـــ ہنس ہنس کر سہیلیاں ایک دوسرے پر پانی اُچھال رہی تھیں اور تیرنے والیوں کے قدموں کی چاپ سے پانی کی بوندیں موتیوں کی پھواروں کی مانند آسمان میں اُڑ رہی تھیں۔

میرا دل کانپنے لگا ـــ یہ حالت خوف کی، خوشی کی یا اُمنڈتے ہوئے شدید جذبات کی وجہ سے تھی ـــ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اچھی طرح سے دیکھوں۔ لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ سوچا کہ ایک بار اچھی طرح کان لگا کر سنوں تو شاید اُن کی ساری باتیں بھی صاف سُنائی دیں گی۔ لیکن کان کو ایک ٹک لگانے سے صرف جنگل کے

جھنگروں کی آواز ہی سُنائی پڑی ایسا محسوس ہوا کہ ڈھائی سو سال کا کالا پردہ میرے ہی سامنے لٹک رہا ہے۔ ڈرتے ڈرتے اُس کا ایک کنارہ اُٹھا کر میں نے دیکھا وہاں بہت بڑی مجلس جمی ہوئی تھی۔ لیکن انتہائی تاریکی کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک ہی سکون اور خاموشی کو ختم کرتی ہوئی تیز ہوا چلنے لگی اور دریا....

.....کا پُرسکون پانی دیکھتے ہی دیکھتے حسین و جمیل دوشیزاؤں کے سیاہ اور دراز گیسوؤں کے مانند بکھرنے سا لگا۔ اور شام کے سلئے ہے اُس جنگل کی ساری سرزمین لمحہ بھر ہی میں ایک ساتھ جاگ اُٹھی۔ گویا کسی سپنے سے چونک ہے۔ خواب کہو یا حقیقت ڈھائی سو سال پُرانے اور ویران محل سے جوبنِ شباب اور نوخیز دوشیزائیں اٹھلاتی، بل کھاتی نیچے دریا میں نہاتے گئی تھیں تیز ہوا چلنے کے بعد وہ اپنے بھیگے ہوئے دراز گیسوؤں کو سنوارتی، اپنے دامن کو نچوڑتی میرے پاس سے ہوکر اُدھر محل میں نہ گئیں — ہوا جس طرح مشک کو اُڑا کرلے جاتی ہے بالکل اسی طرح ہوا کے ایک جھونکے سے وہ بھی اُڑ کر نجانے کہاں غائب ہوگئیں۔

اُس وقت میرے دل میں یہ خیال ہوا کہ اس تنہائی کے عالم میں میرے دل میں کہیں شعر و شاعری کے جذبات تو نہیں جاگ رہے — ! میں بےچارہ روئی کی چنگی وصول کرکے کسی طرح اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ کہیں یہ ستیاناسی میرا بیڑہ نوغرق نہیں کرتے آرہی ہے — سوچا ذرا اچھی طرح کھانا کھانا ہوگا — خالی پیٹ میں ہی ایسے لاعلاج مرض آکر جمع ہوجاتے ہیں۔ اُسی وقت میں نے اپنے باورچی کو بلا کر خوب گھی اور مصالحہ دار پلیٹ تیار کرنے کا حکم دیا۔

اگلے دن سویرے یہ سب باتیں انتہائی مضحکہ خیز لگنے لگیں۔ خوشی خوشی صاحبوں کی طرح سولا ہیٹ پہنے، ہاتھوں سے گاڑی ہانکتا ہوا اپنے کام پہ چلا گیا۔ اُس دن شاہی

رپورٹ لکھنے کا دن تھا۔ اس لئے دیر سے گھر لوٹنے کی بات تھی۔ لیکن شام ہوتے
ہی کوئی مجھے گھر کی طرف کھینچنے لگا۔۔ کون مجھے کھینچنے لگا۔۔ یہ نہیں کہہ سکتا۔۔ لیکن
دل کہنے لگا کہ اب دیر نہیں کرنی چاہئے۔ دل کہنے لگا کہ سب لوگ بیٹھے ہوں گے
رپورٹ ادھوری چھوڑ کر جیسٹ پہن لیا۔ اور اُس شام کے سائے سے ہم آغوش
سنسان راستے کو رتھ کے پہیوں کی آواز سے چوکنا کرتا ہوا اُس قدیم تیرہ و تار
ویران محل میں پہونچ گیا۔

سیڑھیوں کے اوپر سامنے کا کمرہ بہت ہی بڑا ہے۔ بڑے بڑے ستونوں کی
تین قطاروں پر محراب دار بنی ہوئی چھت تھی۔ یہ وسیع و عریض کمرہ اپنا سونا پن
لئے دن رات سائیں سائیں کیا کرتا تھا۔ اُس دن شام کو اس وقت بھی شمع نہیں جلائی
گئی تھی! دروازہ کھول کر جون ہی میں اُس ویران کمرے میں داخل ہوا ویسے ہی مجھے
محسوس ہوا کہ گویا وہاں بڑا بھاری ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔۔ جیسے اچانک
ہی مجلس ختم کر کے چاروں طرف کے دروازے کھڑکیاں۔ راستے، برآمدے
جسے جدھر راہ ملی اُدھر ہی بھگدڑیں لگ گئی۔ کون کدھر گیا ہے یہ پتہ نہ چلا۔ میں
کہیں کسی کو نہ دیکھ کر بے تابی اور بے قراری کے عالم میں کھڑا رہا۔ جسم کسی جذبۂ عجیب
کی شدت سے کانپنے لگا۔ گویا بہت دنوں پرانے عطر اور تیل کی مہک میری ناک
میں گھسنے لگی ہو۔ میں اُس تیرہ و تار خاموش، پُر سکون وسیع و عریض کمرے کے ستونوں
کے درمیان کھڑا ہوا کانپنے لگا۔۔۔ جھر جھر کرتا ہوا فوارے کا پانی سفید پتھر
پر گر رہا ہے۔ ستار پر کون سا راگ بج رہا ہے۔۔۔؟ سمجھ نہ سکا۔ کہیں طلائی
زیورات کی رُن جھُن، تو کہیں پائلوں کی جھنکار۔۔ کہیں تانبے کے بہت بڑے
گھڑیال کی تیز طرار آواز۔۔۔ بہت دور نوبت کی میٹھی تان۔ ہوا میں ڈولتے ہوئے
بلور کے بڑے بڑے فانوسوں کی آپس میں ٹکرانے کی آواز۔۔ برآمدے کے

پنجرے میں بلبل کا چہچہانا ۔ باغ کے پالتو سارسوں کی پکار ۔۔۔ سب نے مل کر گویا میرے چاروں طرف ایک سحر آفریں راگ چھیڑ دیا تھا ۔

میرے دل میں ایک عجیب قسم کی خواہش اور ہمت جاگنے لگی ۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں ۔ محسوس کر رہا ہوں وہی حقیقت ہے باقی سب کچھ سراب ہے ۔ دھوکہ ہے ۔۔۔ میں ۔ یعنی ساڑھے چار سو روپے روپیہ ماہوار پانے والا اردوئی کا کلکٹر ۔۔۔ ہیٹ اور چھوٹا تنگ کرتہ پہن کر ٹم ٹم ہانک کر دفتر جانے والا ۔۔۔ خود کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ میرے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے ۔ یہ سب کچھ فریب ہے ' جھوٹ ہے ۔ ان بے سروپا مناظر میں ذرا بھی حقیقت نہیں ۔۔۔ یا اس عظیم وسیع ' پرسکون اور خاموش کمرے کے درمیان کھڑا فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنس دیا ۔

تھوڑی دیر بعد میرا مسلمان نوکر مٹی کے تیل کا جلتا ہوا لیمپ ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہوا ۔ اس نے مجھے پاگل سمجھا یا نہیں ۔ لیکن اسی لمحہ مجھے یاد آیا کہ میں فلاں مرحوم شخص کا فلاں اکلوتا بیٹا ہوں ۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنے لگا کہ سنسار کے اندر یا باہر کہیں پر بھی خاموشی اور پرسکون فوراً تیزی سے چلنے لگتا ہے یا نہیں ۔ اور کہیں پر نظر نہ آنے والی اُمنگوں کے رقص سے کسی پراسرار ستار سے سحر آفریں دُھن اُبھرتی ہے یا نہیں ۔۔۔ ؟ یہ ہمارے عظیم شعراء ہی بتا سکتے ہیں لیکن یہ بات تو سولہ آنے سچ ہے کہ میں کھڑوچ کی منڈی میں روئی کا ٹیکس وصول کر کے مہینے میں ساڑھے چار سو روپے تنخواہ لیتا ہوں ۔۔۔ پھر میں چند لمحے پہلے کی طلسم ہوشربا سے متعلق باتیں یاد کر کے ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اخبار دیکھتا ہوا چہرہ کا لے لے کر مسکرانے ہنسنے لگا ۔

اخبار پڑھ کر مغل کھانا کھا کر میں اپنے کونے والے چھوٹے سے

کمرے میں جا کر بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ میرے سامنے کی کھلی کھڑکی سے اندھیارے جنگلوں سے گھرے کوہ اروالی کی چوٹی کے اوپر ایک جگمگاتا ہوا ستارہ، کروڑوں اربوں میل کے فاصلے سے ———— ، اس معمولی سے "کیمپ کھاٹ" پر پڑے حضرت جنگی کلکٹر کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے اکتا کر کب سو گیا، کہہ نہیں سکتا۔ کتنی دیر تک میں سوتا رہا یہ بھی نہیں جانتا۔ یکایک میں ہڑ بڑا کر جاگ گیا۔ کمرے میں کوئی آواز آئی یہ ایسی بات نہیں۔ یا کوئی کمرے میں داخل ہوا ہو ایسا بھی کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ تیرہ و تاریک پہاڑی کی چوٹی کے اوپر جگمگاتا ہوا ستارہ اب ڈوب چکا تھا اور اندھیرے پکھواڑے کی پھیکی چاندنی تاریکی سے ڈرتی ہوئی سہمی سہمی اندر آ رہی تھی۔

کسی شخص کو دیکھ نہ سکا۔ اس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص مجھے آہستہ آہستہ ہلا رہا ہے۔ میرے جاگنے کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولا۔ صرف طلائی انگوٹھیوں سے جگمگاتی ہوئی پانچوں انگلیوں کے اشارے سے اُس نے مجھے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

میں بہت ہی دبے پاؤں اُٹھا۔ اگرچہ اس عظیم الشان سنسان اور ویران محل کے وسیع و عریض کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ پھر بھی قدم قدم پر یہی احساس دل میں سمایا رہا کہ کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔ اس محل کے زیادہ تر کمرے بند رہتے تھے۔ اور اُن کمروں میں کبھی میں گیا بھی نہیں تھا۔

اُس رات کو نہایت خاموشی اور احتیاط کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا کسی انجانی شخصیت کے اشارے پر میں کہاں چلا جا رہا تھا، آج بھی واضح الفاظ میں بتا نہیں سکتا۔ کتنے تیرہ و تاریک برآمدے خاموشی اور پُر سکون صحن اور گلیارے کتنے لمبے لمبے آنگن۔ کتنے تاریک سنسان کمرے، کتنی ویران اور اُجاڑ کوٹھریاں

پار کر کے میں اُس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا کچھ کہہ نہیں سکتا۔

اگرچہ میں اُس پُراسرار نامعلوم شخصیت کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا پھر بھی اُس کی شکل و شبیہہ میرے دل سے چُھپ نہ سکی ــــ عرب کی نوخیز طرحدار دوشیزہ۔ اُس کی ڈھیلی ڈھالی آستینوں میں سے سنگِ مرمر ایسے گداز اور سڈول بازو دکھائی دے رہے تھے۔ جبیں کے کنارے سے ایک باریک کپڑے کا نقاب اُس کے چہرے پر اُتر آیا تھا۔ اور اُس کی کمر سے ایک بانکی چُھری بندھی ہوئی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا۔ گویا الف لیلےٰ کی ہزار راتوں میں سے کوئی ایک رات ناولوں کی دُنیا میں سے اُجڑ کر یہاں چلی آئی ہے اور میں گویا بغداد کی تاریک گلیوں میں بھٹک رہا ہوں۔

بالآخر وہ میری نامعلوم راہبر ایک گہرے نیلے رنگ کے پردے کے سامنے مجھے کھڑا کر کے خود بھی ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور مجھے نیچے کی طرف انگلیوں کے اشارے سے کچھ دکھانے لگی۔ نیچے کچھ دکھانے لگی۔ نیچے کچھ بھی نہ تھا۔ پھر بھی خوف سے میرا خون خشک ہو گیا ــــ میں نے یہ محسوس کیا کہ اس پردے کے سامنے کمخواب کا لباس زیب تن کئے۔ برہنہ تلوار لٹکائے۔ دونوں پاؤں پھیلائے ایک خوفناک مکروہ شکل حبشی خوجہ بیٹھا بیٹھا اونگ رہا تھا۔ میری راہبر دوشیزہ ہلکے قدموں سے اُس کے دونوں پیروں کو پھلانگ گئی ــــ اور پردے کے ایک کنارے کو پکڑ کر اُٹھا یا۔

اندر کے کمرے کا کچھ نظر آیا۔ جس میں ایرانی قالین بچھایا ہوا تھا۔ اندر کے تخت کے اوپر کون کون بیٹھا ہے صاف صاف دکھائی نہ دیا۔ صرف زعفرانی رنگ کے ڈھیلے پاجامے کے نیچے زری دار ناگرے پہنے دو چھوٹے چھوٹے

خوبصورت پاؤں گلابی رنگ کے تخت پر جھکے ہوئے انداز میں دکھائی دئے۔ فرش پر ایک طرف طلائی منقش برتن میں چند سیب، ناشپاتی، نارنگی اور انگوروں کے گچھے رکھے تھے۔ اُس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا پیالہ اور سنہرے رنگ کی شراب سے لبریز شیشے کے پیمانے مہمان کے لئے انتظار کر رہے تھے۔ کمرے کے اندر سے ایک عجیب قسم کا دھواں اُبھر رہا تھا۔ اور مجھ پر غنودگی سی طاری کر رہا تھا۔

کانپتے اور لرزتے قدموں کو بڑھا کر جوں ہی میں اُس کے پاؤں کو پار کرنے لگا۔۔ عین اُسی وقت وہ چونک کر جاگ اُٹھا۔ اُس کی آغوش کی تلوار پتھر کے فرش پر جھن سے گر پڑی۔

یکبارگی مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ اپنے گرد و نواح میں دیکھا تو محسوس کیا کہ اپنی کیمپ کھاٹ پر پسینے سے شرابور بیٹھا ہوا ہوں۔ صبح کی روشنی میں تھکا ہوا رات بھر کا تھکا ماندہ چاند کئی کئی دن کے جاگے ہوئے مریض کی طرح پیلا پڑ گیا ہے اور باہر ہم لوگوں کا واقف مہر علی معمول کے مطابق صبح کے سنسان راستوں پر "دور رہو ـــ دور رہو ـــ !!" چلّاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

اس طرح سے میری الف لیلےٰ کی ایک رات اچانک ہی ختم ہو گئی۔ لیکن اب بھی ایک ہزار راتیں باقی ہیں۔

میرے دن کے ساتھ رات کی مخالفت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی ـــ دن کو تھکا ہوا جسم لے کر کام پر جانا اور خاموش خوابوں سے پُر۔ سحر آفریں طلسمی رات کو کوسنے لگتا اور پھر شام کو گھر لوٹنے کے بعد دن کے کام کاج بھری حقیقت کو بالکل بیکار۔ پُر فریب۔ سراب اور مضحکہ خیز سمجھنے لگتا۔

شام کے بعد میں ایک نشے کے حال میں مدہوش ہوکر اُلجھ جاتا تھا۔ اور اس وقت میں سینکڑوں سال پہلے کی کسی غیر معروف تاریخ کا ایک عجیب وغریب کردار نبھاتا۔ اور تب مجھے وہ ولایتی چھوٹا کرتہ اور کسی کسی پتلون بالکل اچھی نہ لگتی تھی۔ اُس وقت میں سر پر لال مخمل کی ٹوپی۔ اور بدن پر ڈھیلا کرتہ پاجامہ، پھولدار قبا۔ اور ریشمی لمبا چوغہ پہن کر رنگین رومال پر عطر ڈال کر بڑے ہی جتن سے میک اپ کرتا اور سگرٹ پھینک کر گلاب کے عرق سے بھری، بہت لمبی اور پیچدار فرشی لئے گدی دار اونچی کرسی کے اوپر بیٹھ جاتا۔ گویا کسی عظیم الشان تقریب کے سلسلہ میں چاق وچوبند بیٹھا رہتا تھا۔

اس کے بعد تاریکی کی جتنی تہیں بڑھتی رہتیں، اُتنی ہی نجانے کیسے عجیب وغریب واقعات وحادثات ظہور پذیر ہوتے رہتے جن کو میں بیان نہیں کرسکتا۔ یا کبھی ایسا لگتا گویا کسی طلسم ہوشربا سے بھر پور کہانی کے کچھ بکھرے ہوئے کردار موسم بہار کی لطیف ہواؤں میں اُڑتے پھر رہے ہوں۔ اُس کہانی کا کچھ حصہ تو ملتا۔ اور اُس کے بعد سلسلہ کھو جاتا۔ اُس کا اختتام نظر نہ آتا۔ میں بھی رات بھر اُن اُڑتے ہوئے منتشر حصوں کا تعاقب کرتے ہوئے کمرے میں بھٹکتا رہتا تھا۔

خوابوں کی اس دُنیا میں مستغرق ہوکر مجھے کبھی تو حنا کی خوشبو محسوس ہوتی تو کبھی ستار کی جھنکار سُنائی پڑ جاتی۔ تو کبھی صاف شفاف پانی کی خنک اور لطیف بوچھاروں سے ہم کنار کسی شوخ وشنگ، سحر طراز نوخیز دوشیزہ کو لمحہ بھر کے لئے دیکھ لیا کرتا تھا۔ وہی شنجرفی پاجامہ پہنے ہوئے اس کے چھوٹے چھوٹے گلابی دونوں پاؤں میں زری دار نوکیلی جوتیاں ہوتیں، اُس کے پُر شباب گداز سینے پر پھولدار انگیا کسی ہوتی اور سر پر ایک لال ٹوپی ہوتی۔ جس کی سنہری جھالر اُس کی چوڑی شفاف پیشانی اور رخساروں کو گھیرے رہتی تھی۔

اُس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں اُس کے نیاز حاصل کرتے ہوئے نیند کی آغوش میں خوابوں کے پُرپیچ راستوں پر طلسمی دُنیا کی گلی گلی میں کوٹھڑی کوٹھڑی میں اُدھر سے اُدھر بھٹکتا پھرتا تھا۔

کسی کسی دن شام کو جب میں قدِ آدم آئینہ کے دونوں طرف دو شمعیں روشن کر کے بڑی دلچسپی کے ساتھ خود کو شہزادے کی مانند سجانے میں مشغول رہتا تو آئینہ میں میرے عکس کے بغل میں لمحہ بھر کے لئے اُس ایرانی دوشیزہ کا سایہ اُبھرتا ـــــ اور اُسی لمحہ بھر میں وہ گردن ٹیڑھی کر، اپنی بڑی بڑی گہری سیاہ پُتلیوں والی آنکھوں سے اپنے دل کے شدید جذبات اور انتہائی بے قراری کا اظہار کرتی۔ خدارا ابروؤں کو عجیب انداز سے گھما کر، ترچھے تراشیدہ، رنگین لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتی۔ طلائی گھنگھروؤں سے سجے ہوئے پاؤں کو رقص کے انداز میں گھماتی ـــــ دعوتِ نظارہ دیتی، جذبۂ خودسپردگی کا اظہار کرتی۔ لمحہ بھر بعد ہی آئینہ ہی میں غائب ہو جاتی۔ عطر بیز ہواؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر خنک ہوا کا ایک جھونکا آتا۔ اور دونوں شمعوں کو گل کر دیتا ـــ اور میں بستر پر لیٹا رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا میرے چاروں اُس ہوا میں کوہ ارادلی کی خاموش وادیوں میں گویا بے شمار پیار انگنت بوسے، اور مرمریں قدموں کی چاپ، گہری تاریکیوں میں تیرتی رہتی تھی۔ میرے کانوں کے پاس کسی کی لطیف گنگناہٹ گونجتی رہتی۔ مجھے اپنی پیشانی پر کسی کے گرم سانسوں کا لمس محسوس ہوتا اور ہوا میں لہراتا عطر بیز دوپٹہ بار بار میری پیشانی کو چھوتا رہتا۔ آہستہ آہستہ ایک خوبصورت دوشیزہ اپنی سحر آفریں مسکراہٹ میں مجھے گرفتار کر لیتی اور میں اطمینان کا سانس لے کر اپنے اُس جسم کو لئے خوابوں کی دُنیا میں سیر کرنے لگتا۔

ایک دن تیسرے پہر میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر گھومنے جانے کا فیصلہ

کیا۔ پتہ نہیں کون مجھے منع کرنے لگی۔ لیکن اُس دن میں نے ایک نہ سُنی ایک کھونٹی پر میرا صاحبی ہیٹ اور چھوٹا کرتہ آویزاں تھا۔ میں اُنہیں اُتار کر پہننے والا ہی تھا کہ اُس وقت دریا کے کنارے کا ریت اور دارادلی کے خشک پتوں کا لہرا، ایک بگولا۔ اچانک آدھمکا اور میرے ہیٹ اور کُرتہ کو اُڑاتا ہوا نجانے کہاں لے گیا۔ اور اُسی کے ساتھ ساتھ ایک شیریں اور قدرے بلند ہنسی اُس بگولے کے ساتھ گھومتی ہوئی نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔

اُس دن گھوڑے کی سواری نہ کی جا سکی اور اُس دن کے بعد میں نے وہ تنگ کرتہ اور ہیٹ پہننا چھوڑ دیا۔

پھر اُس دن آدھی رات کو میں چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ گویا کوئی لڑکی زار و قطار رو رہی ہے۔ گویا میرے تخت کے نیچے سے فرش کے نیچے، اُس رنگ محل کے پتھر کی بنیاد کے نیچے سے ایک انتہائی تاریک قبر سے وہ رو رو کر کہہ رہی ہے:

"مجھے تم آزاد کر کے یہاں سے کہیں دور لے چلو ——! اس طلسم ہوشربا اس گہری نیند اور بے نتیجہ خوابوں کے تمام دروازے توڑ کر تم اپنے گھوڑے پر مجھے بٹھا کر اپنے سینے سے لگا کر جنگل کے اندر سے، پہاڑی کے اوپر سے، ندی پار کر کے سورج کی کرنوں سے جگمگاتے ہوئے اپنے کمرے میں سے لے چلو—— مجھے آزاد کر دو——"

'میں کون ہوں ——؟ میں کیسے تمہیں آزاد کراؤں ——؟ میں اس گھومتے ہوئے اور بدلتے ہوئے خوابوں کی روانی میں سے کسی ڈوبتی ہوئی نوخیز، پُرشباب حسینہ کو نکال کر باہر لاؤں ——؟ تم کہاں تھیں ——! اے نظر نہ آنے والی، دلفریب، دلکش، پُراسرار حسینہ! تم کہاں تھیں ——؟

کسی سرد آبشار کے پاس کھجوروں کے سائے میں کسی بدبخت عورت کی آغوش میں تم نے جنم لیا تھا۔ تمہیں کون سنگدل ڈاکو جنگلی پودے کی کچی کلی کی طرح ماں کی گود سے توڑ کر برق رفتار گھوڑے پر بٹھا کر ریگستان کے جلتے ہوئے بارود کو پار کر کے کس محل کے نزدیک غلاموں کی خرید و فروخت کرنے والے بازار میں لے آیا تھا ـــــ!! وہاں کس بادشاہ کے ملازم نے تمہارا نوخیز۔ زہد شکن حسن شباب دیکھ کر چند طلائی سکوں کے عوض تمہیں خرید لیا تھا ـــــ؟ اور سمندر پار کر سونے کی پالکی میں بٹھا کر تمہیں اپنے مالک کے حرم کی رونق بڑھانے کیلئے بھینٹ کر گیا۔؟ وہاں کی تاریخ کیسی تھی ـــــ؟ وہاں کی سارنگی کی دُھن، پائلوں کی جھنکار اور سنہری خوش رنگ، شراب کے درمیان، آنکھوں کو خیرہ کرنے والے خنجروں کی چمک، زہریلی آگ۔ جیونوں کی چوٹ کیسی تھی وہ ـــــ؟ کتنی بے شمار دولت تھی اور بڑا کتنا تھا قید خانہ وہ ـــــ؟ دونوں طرف دو خادمائیں کنگن پر جڑے ہیرے کے نگ چمکاتی ہوئی چنور ہلا رہی تھیں۔ شہنشاہ۔ بادشاہ، اُس کے مرمریں بازوؤں کے نیچے ہیرے اور موتیوں سے سجی ہوئی جو تیوں کے پاس لوٹ رہے تھے۔ باہر دروازے کے پاس یم دوت کی شکل ایسا بھیانک جلشی، دیو دوت ایسا لباس زیب تن کئے ہاتھوں میں برہنہ تلوار لئے کھڑا تھا۔ اُس کے بعد خون خرابے، حسد اور رشک کی آگ۔ نفسانی خواہشات کی جوالا سے بچکر تم کہاں جا کر چھپ گئیں۔ تمہیں کہاں پناہ ملی ـــــ کس نے کس جگہ تمہیں قید کر دیا ـــــ؟؟؟

اُسی وقت وہ پاگل مہر علی چلانے لگا ـــــ

"دور رہو ـــــ! دور رہو ـــــ!!! جھوٹ ہے ـــــ! سب جھوٹ ہے ـــــ!!!"

آنکھ کھول کر دیکھا ـــــ سویرا ہو گیا ہے۔ چپراسی نے آکر ڈاک کے خطوط

دئے۔ میرے باورچی نے آکر سلام کرتے ہوئے کہا —
"آج کیا کھانا بنے گا — ؟"
میں نے کہا — "نہیں۔ اب اس مکان میں مزید رہنا نہیں چاہتا —"
اُس دن اپنا سب اسباب اور سامان لے کر میں دفتر کے کمرے میں آپہونچا۔ دفتر کا بوڑھا کلرک کریم خاں مجھے دیکھ کر قدرے مسکرایا — مجھے اس کی مسکراہٹ سے کچھ جھنجلاہٹ سی ہوئی۔ اور بغیر جواب دئے میں اپنا کام کرنے لگا — !

جس قدر شام نزدیک آنے لگی اُسی قدر میرے دل کی بے چینی اور بے قراری بڑھتی گئی — ایسا محسوس ہونے لگا۔ گویا فوراً ہی مجھے کہیں جانا ہے رزئی کے حساب کی پڑتال کرنا مجھے بالکل غیر ضروری نظر آنے لگا۔ نظام کی نظامت بھی مجھے کوئی خاص چیز معلوم نہیں ہوئی۔ میرے گردو نواح جو کچھ بھی نظر آرہا ہے۔ میرے آس پاس جو کچھ بھی چل پھر رہا ہے۔ محنت و مشقت کر رہا ہے خوردونوش میں مصروف ہے — یہ سب باتیں مجھے بالکل ہی ناچیز۔ بالکل ہی بے کار اور افلاس زدہ محسوس ہونے لگیں۔

میں نے قلم پھینک دیا۔ موٹے موٹے ضخیم بہی کھاتے بند کر دئے — فوراً ٹم ٹم لے کر روانہ ہو گیا — دیکھا — عین شام کے وقت ٹم ٹم خود بخود اُس رنگ محل کے پھاٹک کے سامنے جاکر کھڑی ہو گئی — اور میں تیز قدموں سے سیڑھیاں طے کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا —
آج گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا — تاریک کمرے گویا ناراض ہو کر منہ پھلائے بیٹھے ہیں۔ شرمندگی اور پشیمانی سے میرا دل بھر آیا — لیکن کہوں تو کس سے کہوں۔ کس سے معافی مانگوں — کوئی ڈھونڈھے سے نہ ملا —

سونا من لئے میں ہر کمرے میں گھومنے لگا۔ جی چاہنے لگا کہ ایک ساز لے کر کسی کے گیت گنگناؤں۔ کہوں ۔۔۔ "اے میری شمع ۔۔۔! جو پروانہ تمہیں چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا ۔۔۔ وہ پھر مرنے کیلئے آ پہنچا ہے۔ اس بار اُسے معاف کر دو ۔۔۔ دونوں پر جلا کر خاکستر کر دو ۔۔۔!!"

اچانک میری پیشانی پر دو بوند آنسو گرے۔ اُس دن اراولی پربت کی چوٹی پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ پہاڑ کی فلک بوس تاریک چوٹیاں اور دریا کا سیاہ پانی شاید کسی کے انتظار میں خاموش اور پُر سکون تھے لیکن وہ خاموشی اور سکوت کس قدر بھیانک محسوس ہو رہا تھا۔ جل تھل آسمان دُھواں دھار برسنے لگا۔ اور اچانک زور سے آندھی چلنے لگی ۔۔۔ بجلی کوندی۔ بادل گرجے ۔۔۔ اور طوفانِ باد و باراں میں اس تیرہ و تار محل ...... میں بھٹکنے لگا۔

آج بھی نوکر دن والے مکان میں تھے۔ آج یہاں بتی جلانے والا بھی کوئی نہ تھا ۔۔۔ اور اس بادلوں سے ڈھکی اماوس کی رات میں محل کے اندر اس کوٹھی سے کالے اندھیرے میں میں نے محسوس کیا کہ ایک حسینہ پلنگ کے نیچے غالیچے پر اوندھی پڑی ہوئی اپنی کسی ہوئی مٹھیوں کے ذریعہ اپنے پریشان اور منتشر بال نوچ رہی ہے۔ اُس کی سفید مرمریں پیشانی سے خون بہہ رہا ہے۔ کبھی تو وہ زہر میں بجھا ہوا قہقہہ لگانے لگتی اور کبھی زار و قطار رونے لگتی ۔۔۔ کبھی دونوں ہاتھوں سے اپنی انگیا پھاڑ کر وہ اپنا برہنہ سینہ پیٹنے لگتی۔ کھلی کھڑکی سے ہوا گرجتی ہوئی آ رہی ہے اور موسلا دھار بارش اُس کا سارا جسم شرابور کر رہی ہے۔

نہ تو ساری رات طوفان رُکا۔ اور نہ اُس کا رونا ہی بند ہوا ۔۔۔۔۔۔!

میں رات بھر بے کار پشیمان اور پچھتاوے کے عالم میں اندھیرے کمروں میں

بھٹکتا رہا۔ کہیں کوئی نہیں ۔ کیسے تسلی دوں ۔۔۔؟ یہ کبھی نہ سنائی جانے والی چیخ و پکار کس کی ہے ۔۔۔؟ یہ زار و قطار کون رو رہا ہے؟؟

یکبارگی پاگل چلا اُٹھا ۔۔۔

" دور رہو ۔۔۔! دور رہو ۔۔۔!! جھوٹ ہے ۔۔۔!

سب جھوٹ ہے ۔۔۔!!! "

چونک کر دیکھا۔ سویرا ہو گیا ہے۔ اور مہر علی موسلا دھار بارش کے دن بھی حسب معمول اُس رنگ محل کا چکر کاٹتا ہوا روز کی طرح چلا رہا ہے ۔۔۔

یکایک مجھے خیال آیا کہ شاید یہ مہر علی بھی میری طرح اس محل میں رہ چکا ہے اور آج پاگل ہو کر نکل جانے کے بعد بھی اس سنگدل شیطان کی مقناطیسی کشش سے کھنچ کر روزانہ علی الصبح اُس کے چاروں طرف چکر لگانے آتا ہے ۔۔۔

اُسی وقت میں بارش میں بھیگتا ہوا پاگل کے پاس گیا اور اُس سے پھر پوچھنے لگا ۔۔۔

" کیوں مہر علی! ۔۔۔ کیا جھوٹ ہے رے ۔۔۔؟ "

میری بات کا کوئی جواب نہ دے کر اس نے مجھے دھکا دے کر نیچے گرا دیا ۔۔۔ پھر وہ بے اختیار پاگلوں کی مانند رنگ محل کے گرد چکر لگانے لگا۔ اپنی تمام تر قوت کو یکجا کر کے وہ خود کو ہوشیار اور چوکنا کرنے کے لئے چلا چلا کر کہنے لگا ۔۔۔

" دور رہو ۔۔۔! دور رہو ۔۔۔!! سب جھوٹ ہے ۔۔۔!!! "

اس طوفان باد و باراں میں پاگل کی طرح بھیگتا ہوا میں دفتر گیا ۔۔۔ اور کریم خان سے پوچھا۔

" اس بات کا آخر مطلب کیا ہے ۔۔۔! مجھے صاف صاف بتاؤ؟ "

بوڑھے کریم نے جو کچھ بھی کہا اُس کا اختصار یہ ہے کہ کسی وقت اِس رنگ محل میں تشنہ اور شہوانی خواہشات اور نفس و ہوس کی کیفیتوں کی لاتعداد شمعیں روشن رہا کرتی تھیں۔ خاکستر معصوم تمناؤں، اُجڑی ہوئی جوانیوں اور لُٹے ہوئے جسموں کے شراب سے ایک ایک ٹکڑا اس رنگ محل کے پتھر کا پیاسا اور لہو کا تڑپ رہا ہے۔ اور لہو کا آدمی ہے جو خون کے پیاسے درندے کی مانند اُس کا خون پی کر اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے ــــــ! آج تک جتنے بھی لوگ اس محل میں تین راتیں رہ چکے ہیں اُن میں سے آج تک اُن کے لقمہ سے کوئی بھی نہ بچا۔

میں نے پوچھا۔

"کیا میری مکتی کا کوئی راستہ نہیں ہے ــــ؟"

بوڑھے کریم خاں نے کہا ــــ

"ایک ہی راستہ ہے۔ لیکن وہ انتہائی دُشوار ہے۔ وہ ترکیب تمہیں بتاتا ہوں ــــ اس گل باغ کی ایک ایرانی خادمہ کا قصّہ بتانا بہت ضروری ہے اس قدر حیرت انگیز اور سنسنی خیز واقعہ شاید ہی دُنیا میں کہیں اور پیش آیا ہو ــــ!"

اُسی وقت سٹیشن کے قلیوں نے آ کر خبر دی کہ گاڑی آ رہی ہے ــــــ! اتنی جلدی ــــ؟ جھٹ پٹ بستر بنڈل باندھتے ہی گاڑی آ دھمکی ــــ اُس گاڑی کے فرسٹ کلاس کے ڈبّہ سے نیند سے جاگا ہوا ایک انگریز مسافر کھڑکی میں سے سر نکال کر سٹیشن کا نام پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہمارے اس ہمسفر دوست کو دیکھتے ہی "ہیلو" کہہ کر چلّا اُٹھا ــــ اور ہاتھ کے اشارہ سے اُس نے اپنے ڈبّہ میں اُسے بُلا لیا۔ ہم لوگ ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبّہ میں بیٹھ گئے۔ پھر اُس ایرانی کنیز والا قصّہ آخری حصہ بھی ہم نہ

سُن سکے —

"یہ آدمی ہمیں بے وقوف سمجھ کر مذاق مذاق میں بُدھو بنا کر چلا گیا —
یہ قصہ شروع سے آخر تک من گھڑت ہے —"

اس قصے کے موضوع پر اپنے ادھیاتم وادی رشتہ دار کے ساتھ میری بحث اس قدر زوردار ہوئی کہ اُن کے ساتھ میرے زندگی بھر کے لئے تعلقات منقطع ہو گئے —— !

• •

ماسٹر

شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان چاروں طرف لال ہو رہا تھا۔ کشتی بہاؤ کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اچانک دل میں کوئی خیال آتے ہی میں نے ملاحوں کو حکم دیا کہ کشتی کو وہاں گھاٹ پر لگا دیں۔ میرا حکم سنتے ہی انہوں نے ایک بہت ہی شکستہ گھاٹ پر لگا دی۔

شام ہو جانے کی وجہ سے ملاحوں نے کشتی کی چھت پر ہی نماز پڑھنی شروع کر دی۔ مغرب میں سرخی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی اور ملاح اپنی نماز میں مشغول تھے۔ اور پانی میں جو سرخ بادلوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔

میں خشکی پر اترا۔ سامنے ایک ٹوٹا پھوٹا مکان (کھنڈر کی صورت میں) نظر آیا۔ جس کی کھڑکیاں اور دروازے سب ٹوٹ چکے تھے۔ ایک طرف کو مکان خمیدہ ہو گیا تھا۔ وہ مکان گھاٹ کے سامنے ہی تھا۔ گھاٹ کے ٹوٹے ہوئے ہونے سے ہندو لوگوں نے وہاں اپنا گھر بار رکھا تھا اور اس وقت

شور مچا رہے تھے۔ اس وقت میں وہاں پر اکیلا بیٹھا ہوا خیالات میں غوطے کھانے لگا۔ اور آخر آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اسی وقت کسی کی آواز نے چونکا دیا۔

"آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں ــــ؟"

گھوم کر دیکھا سامنے ایک معزز آدمی کھڑا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت دنوں سے بہت بھوکا ہے۔ اور غربت اُس کے کپڑوں سے ٹپک رہی تھی۔ لباس بھی سادہ تھا۔ ایک دھوتی اُس کے اوپر لمبا کوٹ۔ مگر بٹن ندارد۔ خیال ہوا کہ شاید وہ شخص ندی پر سیر کرنے آیا ہے اور کھانے کی بجائے ہوا سے پیٹ بھرے گا۔

وہ شخص میرے نزدیک ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور میرے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے کہا ــ "میں الٰہ آباد سے آ رہا ہوں ــ"

"آپ کیا کام کرتے ہیں ــ؟"

"کاروبار ــــ!"

"کن چیزوں کا ــ؟"

"ریشم وغیرہ کا ــ!"

"آپ کا نام ــــ......؟"

میرے دل میں کوئی شک گزرا۔ مگر میں نے اُس کو اپنا غلط نام بتا دیا۔

"آپ کس واسطے یہاں آ رہے ہیں ــ؟"

"صرف سیر کرنے کی غرض سے۔ کشتی میں بیٹھے ہوئے یہ جگہ بھلی لگی۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ چلو کچھ روز یہاں رہ لیں۔"

وہ کچھ حیران سا ہو گیا۔ آخر بولا — "جناب میں بھی کئی برسوں سے یہاں ہی رہتا ہوں۔ مگر میری صحت میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا۔"

"مگر یہ تو ماننا پڑے گا کہ یہاں کی آب و ہوا الہ آباد سے بہت ہی اچھی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر آپ قیام کس جگہ کریں گے — !"

"اُس مکان میں — !" میں نے ٹوٹے ہوئے مکان کی طرف سے اشارہ کیا۔

اُس کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی خفیہ خزانہ مجھے اس گھر میں مل گیا ہے —

اُس نے اور کوئی سوال نہ کیا۔ ملکہ مجھے ایک لمبا چوڑا قصہ سنانا شروع کر دیا جو کہ آج سے کئی برس پہلے اس جگہ ہی واقع ہوا ہے۔

اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ اس جگہ قریب کے گاؤں میں سکول ماسٹر ہے۔ دُبلا ہونے کے باوجود بھی اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرے سے نور برس رہا تھا۔

ملاح نماز مغرب سے فراغت پا کر کھانا نیانے میں مشغول تھے اور وہ کھنڈر اندھیرے میں ڈراؤنا سا لگ رہا تھا۔

ماسٹر صاحب بولے۔

"میں پہلے لکھنؤ میں سکول ماسٹر تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مجھے معلوم ہوا کہ اس مکان میں لالہ بدری ناتھ سیٹھ عرصہ پندرہ سال سے رہ رہے تھے — وہ تعلیم یافتہ تھے۔ ایشور نے دولت خوب دی ہوئی تھی۔ چاروں طرف خوشی ہی خوشی نظر آ رہی تھی۔ نوکروں کی کمی نہ تھی۔

تعلیم یافتہ ہونے کے باعث لالہ بدری ناتھ نئی تہذیب کے دلدادہ تھے پرانی اور دقیانوسی باتوں سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔ بڑی بڑی سوسائٹیوں میں اُن کی پہونچ تھی لالہ بدری ناتھ شادی شدہ تھی۔ عورت بڑی خوبصورت تھی۔

اُن کی زندگی عیش سے گذر رہی تھی۔

بدری ناتھ کی بیوی کو بنارسی ساڑھی اور زیوروں کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر دم انہی خیالات میں رہتی تھی کہ زیور ہی اکٹھے کرتی رہوں۔ نتیجہ یہ کہ اپنے خاوند کی محبت سے محروم رہی۔ کیونکہ اس کی ہر خواہش جلد ہی پوری ہو جاتی تھی لالہ بدری ناتھ نے بھی کبھی اس بات کا خیال نہ کیا۔ وہ بہت ہی سیدھے سادے آدمی تھے۔ مالتی نے اپنے خاوند کو زیور اور کپڑے پیدا کرنے والی مشین سمجھ رکھا تھا۔

سیٹھ بدری ناتھ کا گھر علیگڈھ میں تھا۔ مگر کاروبار یہاں پر تھا۔ کل خاندان لالہ بدری ناتھ دو چھوٹے بھائی اور ایک بوڑھے چچا پر مشتمل تھا۔ وہ شادی کے بعد فوراً ہی مالتی کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

مالتی سنجیدہ مزاج تھی زیادہ بات چیت نہ کرتی تھی۔ وہ تمام دن گھر پر ہی رہا کرتی تھی۔ ہمسایوں سے بھی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ صرف مطلب کی بات۔ ہر ادنیٰ واعلےٰ چیزوں کو قرینے سے اور سنبھال کر رکھتی تھی۔ خاوند کی محبت کو چھوڑ کر اُس نے کچھ سرمایہ جمع کر رکھا تھا خوبصورتی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ لوگ حیران تھے کہ تیس برس کی ہونے پر بھی مالتی بمشکل اٹھارہ اُنیس سال کی معلوم ہوتی تھی۔

جن کا دل برف کی طرح سرد ہے اور جن کے دل میں محبت کی جلن نہیں ہے وہ زیادہ دیر تک تازہ رہتا ہے۔

انتا دو بیم ہونے کے باوجود بھی مالتی کی گود خالی رہی گویا کہ بھگوان نے مالتی کو ایسی چیز نہ دی تھی جس کی کہ وہ اپنے لوہے کے صندوق میں رکھے ہوئے جواہرات سے زیادہ قدر کرتی اور جو کہ اُس کے برف جیسے ٹھنڈے دل کو محبت کی گرمی پہنچا کر پگھلا دیتی اور دل میں محبت کے شعلے پیدا کرتی۔

مالتی جسم کی مضبوط تھی گھر کا سب کام خود کرتی تھی۔ اُس نے زیادہ نوکر نہ رکھے ہوئے تھے۔ سب کام وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ اُس کو کسی کا فکر نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ کسی سے محبت کرتی تھی۔ اُسے اپنے پتی سے بھی کوئی خاص محبت نہ تھی وہ تو صرف روپیہ جمع کرنا ہی جانتی تھی۔ اسی لئے اُسے خوشی غمی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

لالہ بدری ناتھ تو صرف مالتی کے صندوق ہی زیورات سے بھرنا جانتے تھے اُن کے دل کا صندوق محبت سے خالی ہی رہا۔۔۔۔"

اچانک ہی پاس کی جھاڑیوں میں گیدڑوں کے چلّانے کی آواز آئی اور کہانی کا سلسلہ چند لمحوں کیلئے ٹوٹ گیا۔ اور اُس وقت ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ ماسٹر صاحب سے کہانی سُن کر بدری ناتھ سے ٹھٹھا کر رہے ہوں۔ آخر جب گیدڑ چُپ ہو گئے تو ماسٹر صاحب پھر بولے۔

لالہ بدری ناتھ کا وسیع کاروبار یکایک بند ہو گیا۔ وجہ کیا تھی مجھے نہ معلوم ہو سکی۔ صرف اتنا ہی سنا کہ بازار کا دھبا جلدی نہ دے سکے اگر اس وقت کچھ پاس ہوتا تو دو چار روز اور گذار سکتے تھے۔ اور کام ٹھپ نہ ہوتا۔ روپے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ اُنھوں نے وہاں کے مہاجنوں سے سود پر روپیہ لینا بھی مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے کہ ساہوکاروں اور عوام کی نظروں سے عزت جاتی رہے گی۔

اس واسطے بدری ناتھ کو خیال آیا کہ کسی دوسری جگہ سے قرض لینا چاہیے پھر خیال آیا کہ اس کے واسطے جائیداد کی ضرورت ہے۔ آخر وقت کو ضائع نہ کرتے ہوئے اُن کو زیورات کا خیال آیا اور وہ سیدھا مالتی کے پاس گیا۔ مگر دل میں ڈرتا تھا۔ کہ شاید ناراض نہ ہو جائے۔ بات کرتے اُس کا دل کانپتا تھا۔

آخر دل کو مضبوط کر کے مالتی کو اپنے دل کی بات کہی اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

مگر جب مالتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو بدری ناتھ کے دل کو چوٹ لگی۔ وہ دل کے درد کو دبا گیا۔

آخر بدری ناتھ نے زیوروں کا خیال چھوڑ دیا۔ اور روپوں کے بندوبست کیلئے علی گڑھ روانہ ہو گیا۔

مالتی نے مشورہ کیلئے اپنے منیم کو بلایا۔ منیم صاحب مالتی کے دور کے رشتہ میں بھائی لگتے تھے اور سیٹھ جی کے پاس منیمی کا کام کرتے تھے۔ دراصل منیم جی کام چور تھے اور صرف رشتہ داری کے زور پر تنخواہ لیتے تھے۔

مالتی نے سب کچھ کہہ کر پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

منیم جی بولے — "معاملہ خطرناک ہے اگر زیورات چلے گئے تو پھر یہ واپس نہ آ سکیں گے —"

مالتی کو جب اس بات کا خیال آیا کہ میرے تمام زیورات کاروبار کی بھٹی میں ڈال دیئے جائیں گے تو اس کا دل کانپ گیا۔ کیونکہ اس کو صرف زیورات سے ہی محبت تھی۔ پھر بولی — "تو کیا کیا جائے —؟"

"زیورات لے کر اپنے والدین کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں محفوظ رہیں گے۔"

دولت رام کو یقین تھا کہ ایسا کرنے سے سارا زیور میرے ہاتھ لگ جائے گا۔

مجبور ہو کر نے پر مالتی راضی ہو گئی۔

فروری کا مہینہ تھا۔ شام کے وقت ایک کشتی گھاٹ پر آ لگی۔ دوسری صبح بہت ہی تڑکے ایک موٹی چادر اوڑھ کر مالتی کشتی پہ آئی منیم جی بھی ساتھ تھے بولے —

"مالتی! لاؤ زیورات کی گٹھڑی مجھے دے دو۔"

ملاحوں نے کشتی کو چلانا شروع کر دیا۔ مالتی نے تمام زیورات پہن لئے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس طرح زیورات حفاظت میں رہیں گے اور بغیر قتل کئے کوئی زیور نہیں لے سکتا۔

کشتی میں زیورات کی گٹھڑی نہ دیکھ کر دولت رام کو بڑی حیرانی ہوئی اُسکو یہ معلوم نہ تھا کہ مالتی زیورات پہنے ہوئے ہے۔

دولت رام بڑے منیم کو لکھ کر دے آئے تھے کہ وہ مالتی کو میکے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ بڑا منیم قدیمی نوکر تھا۔ بدری ناتھ کے باپ کے وقت سے کام کر رہا تھا۔ وفادار تھا۔ دولت رام کی طرح نمک حرام نہ تھا۔ بہت سٹ پٹایا۔ آخر اک خط بدری ناتھ کو لکھا۔ بدری ناتھ کو معلوم ہو گیا کہ عورت کو آزادی دینا مرد کی بے وقوفی ہے۔

بدری ناتھ نے مالتی کے دلی خیالات کو بھانپ لیا۔ دل پر گہری چوٹ لگی۔ اُس نے دل میں کہا کہ ـــ اتنا نقصان ہوتے پر بھی میں نے زیورات کو ہاتھ نہ لگایا اور یہاں چلا آیا ـــ مگر افسوس کہ اس پر بھی مالتی کو اعتبار نہ آیا۔ افسوس کہ اُس نے مجھ کو نہ پہچانا۔

بدری ناتھ نے صبر کر لیا اور کہا ـــ اگر مالتی کی ایسی ہی مرضی ہے تو ہونے دو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا ـــ اور اس بات کی قسم کھائی کہ وہ عورت کے ساتھ کسی قسم کی بات نہ کرے گا اور نہ ہی اُسے کوئی خط لکھا۔

دو ہفتوں کے بعد لالہ بدری ناتھ روپیہ وغیرہ اکٹھا کر کے لائے۔ اور تکلیف سے نجات حاصل کر کے گاؤں واپس لوٹے۔ اُن کا خیال تھا کہ مالتی اب تک واپس آ گئی ہو گی۔ انہیں خیالات میں وہ گھر میں داخل ہوا۔ مگر دروازہ کو بند پایا۔

قفل توڑ ڈالا۔ اندر کی حالت دیکھ کر بدری ناتھ گھبرا گیا۔ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی دکھائی دی۔ گھر سونا پڑا تھا۔ ایک کونے میں لوہے کا صندوق کھلا۔ مگر خالی پڑا ہوا تھا۔ دل پر گہری چوٹ لگی ـــــ سوچنے لگا ـــــ یہ دُنیا بھی عجیب ہے۔ محبت اور کاروبار بھی فضول ہیں۔ ہم اس دُنیا کے پنجرے کی ہر ایک سلاخ پر اپنی جان دیتے ہیں۔ مگر اس میں چڑیا نہیں ہے۔ وہ رکھنے پر بھی اُس میں نہیں رہتی ہے۔ دُنیا فضول نظر آنے لگی اور دل تھام کر بیٹھ گئے۔

مالتی کو لانے کیلئے کوشش کرنا بدری ناتھ نے فضول جانا اور دل میں سوچا کہ اگر اس کا دل چاہا تو خود ہی آ جائے گی ـــــ بوڑھے منیم نے کہا ـــــ اس طرح چُپ رہنے سے کیا ہوگا۔ مالتی کی خبر تو لینی ہی چاہیئے۔

آدمی بھیجا گیا۔ مگر خبر آئی کہ نہ ہی مالتی اور نہ دولت رام گھر آیا ہے ـــــ چاروں طرف ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ ندی کے کنارے کنارے کنارے طرح طرح کے سوالات کرتے ہوئے لوگ تلاش میں لگ گئے۔ دولت رام کے واسطے پولیس میں خبر دی گئی ـــــ مگر بے سود...... یہ کوئی معلوم نہ کر سکا کہ کس کشتی میں سوار ہوئے تھے۔ اور اُس کشتی کا ملاح کون تھا۔ آخر بہت تلاش کے بعد بھی کوئی پتہ نہ چل سکا تو بدری ناتھ غیر آباد گھر میں واپس آ گئے۔

جنم اشٹمی کا دن تھا۔ صبح ہی سے برسات کی جھڑی لگ گئی تھی۔ بوندا باندی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ گاؤں کے مندروں میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ بہت دور سے آ آ کر لوگ یہاں جمع ہو رہے تھے۔ اسی لئے یہاں ایک میلہ لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کئی مندروں میں تو کیرتن بھی ہو رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے گانوں کی آواز دھیمی ہو جاتی تھی ـــــ یہ جو جھیڑ کے پاس ڈھیلہ دروازہ ہے اس جگہ سیٹھ جی بیٹھے ہوئے تھے ـــــ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ـــــ پانی کے چھینٹے اور گانوں کی سریلی آواز

گھر کے اس کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ مگر سیٹھ جی کا خیال ان سب کی طرف نہ تھا۔ دیوار پر دو عدد فوٹو لٹک رہے تھے ایک طرف تولیہ اور کنگھا لٹک رہا تھا۔ اور ایک طرف ساڑھی الماری میں تہہ کئے رکھی تھی۔ ایک طرف میز پر مالتی کے ہاتھ کے لگائے ہوئے پان سوکھے پڑے تھے۔ دروازے کے سامنے کی الماری میں خوشبودار تیل عطر، چینی کے کھلونے، تاش، صابن اور بھی کئی قیمتی چیزیں بڑی صفائی سے رکھی ہوئی تھیں ایک میز پر وہ لیمپ بھی یونہی پڑا ہوا تھا۔ جو کہ مالتی خود اپنے ہاتھ سے جلایا کرتی تھی۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر بدری ناتھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اس طرح بڑبڑانے لگا "آؤ مالتی آؤ۔۔۔ اپنا لیمپ تم جلاؤ۔۔۔ اور کمرے کو روشن کرو۔۔۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر عمدہ ساڑھی پہنو۔۔۔ یہ سب چیزیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔۔۔ صرف یہی چاہتا ہوں کہ ایک دفعہ آ کر اس اجڑی ہوئی دنیا کو بسا کر اس میں جان ڈال دو۔۔۔"

آدھی رات گذر چکی تھی معلوم نہیں کہ کب مینہہ اور گانا بند ہو گیا۔۔۔ مگر بدری ناتھ وہاں پر اسی طرح بیٹھے رہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔

اُسی وقت کھٹکھٹانے کی آواز سُنائی دی اور زیورات کی جھنکار کی آواز بھی سنائی دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ آواز گھاٹ پر سے آ رہی ہے۔۔۔ ندی کا پانی بھی نظر نہ آتا تھا۔ بدری ناتھ اس آواز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔۔۔ دل کی خواہش بڑھتی گئی۔

وہ آواز گھر کی طرف آہستہ آہستہ آتی ہوئی سُنائی دی اور گھر کے سامنے آ کر رُک گئی۔ چوکیدار دروازہ بند کر کے ناچ وغیرہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اور زیورات کی جھنکا

بھی سنائی دے رہی تھی۔ گویا کہ کوئی زیورات سے دروازہ کو کھٹکھٹا رہا ہے۔

بدری ناتھ سے اب نہ رہا گیا۔ اندھیرے ہی میں ٹٹولتے ہوئے وہ دروازہ کے پاس آ گئے۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اور وہ دروازہ کو جب زور سے کھولنے لگا تو اُس کی نیند بھی کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ میں نیند ہی میں یہاں تک آ گیا ہوں تمام جسم پسینہ پسینہ ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے۔ اور دل کی دھڑکن زوروں پر ۔ نیند کھلنے پر بدری ناتھ نے دیکھا کہ وہاں پر کچھ نہیں تھا۔ صرف موسلا دھار بارش اور گلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

گو یہ سب شروع سے آخر تک خواب تھا۔ مگر بدری ناتھ کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ دُنیا کی کوئی قیمتی چیز کھو بیٹھا ہے۔ پانی کے گرنے کے ساتھ ہی دور کوئی گا رہا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جاگنا ہی خواب ہے اور یہ دُنیا ہی جھوٹ ہے۔

دوسرے دن بھی ناچ وغیرہ تھا۔ دربان چھٹی لے گیا تھا۔ اور سیٹھ جی نے اُسے حکم دیا تھا کہ آج رات بھر دروازہ بند نہ ہو۔

دربان نے عرض کی ۔ "حضور ناچ دیکھنے کیلئے دور دور سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ دروازہ کھلا رکھنے سے خطرہ ہے۔"

بدری ناتھ نے اس بات پر کوئی دھیان نہ دیا ۔ دربان نے پھر کہا ۔

"حضور! میں رات بھر پہرہ دوں گا ۔ !"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ۔ تم ناچ جا کر دیکھو ۔ !"

دربان یہ سُن کر بڑا حیران ہوا ۔ !

دوسرے دن پھر بدری ناتھ شام کو لیمپ وغیرہ بجھا کر پھر اُسی کھڑکی میں آکر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مینڈک ٹرا رہے تھے ۔ گانے والوں کی آواز بھی سُنائی دے رہی تھی۔

یکایک چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ بدری ناتھ سمجھ گئے کہ گذشتہ رات والا وقت آ گیا ہے۔ کل کی طرح پھر گھاٹ پر سے زیورات کی جھنکار سُنائی دی۔ لیکن بدری نے اس وقت اُس طرف نہ دیکھا۔ وہ ڈرے کہ کل کی طرح پھر یہ خواب مٹ نہ جائے۔

اُنہوں نے اپنے دل کو مضبوط رکھنے کی کوشش کی۔ کاٹھ کے پتلے کی طرح چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ آج آواز گھاٹ پر سے آ رہی تھی اور پھر دروازے میں داخل ہو گئی۔ بدری ناتھ کو معلوم ہوا کہ جیسے وہ آواز سیڑھیوں کے اوپر آ رہی ہے۔

اب بدری ناتھ دل کو نہ روک سکے۔ دل میں طوفان بپا ہو گیا۔ سانس رُک گئی۔ وہ آواز اوپر آ کر کمرے کی دہلیز پر آ کر رُک گئی۔ اب صرف اندر داخل ہونا باقی تھا۔

بدری ناتھ سے نہ رہا گیا۔ وہ بجلی کی طرح چلا اُٹھے۔ "مالتی ۔۔۔!" نیند ٹوٹ گئی اور وہ گیارہ ہو گئی۔ دیکھا کہ آواز مکان کے اندر چاروں طرف گونج رہی ہے اور باہر وہی مینڈکوں کا ٹرانا اور گانے کی آواز سُنائی دے رہی ہے۔

بدری ناتھ نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ دے مارا۔

دوسرے دن حکم ہوا کہ میرے سوا رات کو گھر میں کوئی نہ ہونا چاہئے۔ نوکروں نے سمجھا کہ آج شاید سیٹھ جی رات بھر پاٹھ کریں گے۔ اُس روز بدری ناتھ نے سارا دن کچھ نہ کھایا۔ یہاں تک کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پیا۔

رات کو پھر اُسی جگہ آ کر سیٹھ جی بیٹھ گئے۔ آج آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ آج دسمی کا دن تھا۔ چاند آج دیر سے نکلے گا۔ میلا ختم ہو گیا تھا۔ اس واسطے ندی میں کوئی کشتی دکھائی نہ دیتی تھی

سارا گاؤں تھکان کی وجہ سے گہری نیند کے مزے سے رہا تھا۔

بدری ناتھ گہری سوچ میں پڑے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گذرے دنوں کی یاد ستانے لگی۔ جب کہ نئی شادی ہوئی تھی۔ اور مالتی اس وقت کیسی حسین نظر آتی تھی۔ وہ زمانہ کتنا اچھا اور خوبصورت تھا۔

بہت دیر تک اسی طرح سوچتے رہے۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

تارے غائب ہو گئے۔ آسمان پر چاروں طرف اندھیرا ہو گیا۔ آج بدری ناتھ کے دل کو کچھ شانتی تھی۔ اُن کو اُمید تھی کہ آج ضرور اُن کی خواہش بر آئے گی۔

روزمرہ کی طرح آج بھی وہ جھنکار گھاٹ کی سیڑھیوں سے ہوتی ہوئی مکان کی طرف آ رہی تھی۔ بدری ناتھ آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے رہے۔ آواز مکان میں داخل ہوئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر برانڈے میں آ گئی۔ اور دروازے پر آ کر کچھ لمحوں کیلئے رُک گئی۔

بدری ناتھ کا کلیجہ کانپ اُٹھا۔ مگر آنکھیں بند ہی رکھیں آواز دروازہ گذر کر کمرے میں پہونچ گئیں۔ اور کمرے کی طرف تمام چیزوں کے پاس سے گذر کر لمحہ بھر ٹھہر کر وہ آواز بدری ناتھ کے پاس آ کر رُک گئی۔

اس وقت بدری ناتھ نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ چاند کی روشنی کمرے میں پڑ رہی ہے اور سامنے ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔

اُس ڈھانچے کی آٹھ انگلیوں میں انگوٹھیاں۔ ہتھیلیوں پر ہاتھ پھول۔ کلائیوں میں کڑے۔ بازوؤں میں بازوبند۔ گلے میں ہار۔ گویا کہ تمام جسم سونے کے زیوروں سے لدا ہوا تھا۔ سب سے زیادہ خوفناک اُس کی آنکھیں تھیں۔ آنکھوں پر بڑا سا رنگ تھا۔ وہی چمک، وہی خوبصورتی نظر آتی تھی۔ جو کہ بدری ناتھ نے

شادی کے وقت مالتی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بدری ناتھ کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہوگیا۔ آنکھیں موندنے کی کوشش کی۔ مگر نہ کر سکے ـــــ اور وہ مردے کی طرح ڈھانچے کی طرف دیکھتے رہے۔

اس ڈھانچے نے بدری ناتھ کو انگلی سے اشارہ کرکے اپنے پیچھے آنے کو کہا ـــــ انگلیوں کی ہڈیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔

بدری ناتھ اٹھ کھڑے ہوئے ـــــ وہ ڈھانچہ کمرے سے باہر آیا۔ اور سیڑھیاں اتر کر نیچے پہونچا اور گھاٹ کی طرف چلا۔ گھاٹ کی تمام سیڑھیاں اتر کر وہ ڈھانچہ پانی کی طرف بڑھا۔ چاندنی چاندنی سے ندی کا پانی چمک رہا ہے ڈھانچہ پانی میں اترا۔ بدری ناتھ نے بھی پانی میں پاؤں ڈالا۔ پانی میں آتے ہی بدری ناتھ کی آنکھیں کھل گئیں۔

سامنے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ ڈھانچہ غائب تھا۔ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔ ندی کے اس پار کے پیپل کے درخت نظر آرہے تھے۔ چاند ستارے لالہ بدری ناتھ سیٹھ کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ لالہ بدری ناتھ کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گہرے پانی میں چلے گئے۔ وہ تیرنا جانتے تھے۔ اور بڑے اچھے تیراک تھے۔ مگر تیر نہ سکے ـــــ اور شاید ہمیشہ کی نیند سو گئے ـــــ!

یہاں تک واقعہ بیان کرنے کے بعد ماسٹر صاحب ذرا رک گئے۔ بہت دیر تک کچھ نہ بولے۔ وہ بھی خاموش رہے۔ اندھیرے کی وجہ سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے۔

"کیا آپ کو اس بات کا یقین نہیں آیا ـــــ؟"

جواب میں میں نے پوچھا۔
"کیا آپ کو یقین ہے ؟"
ماسٹر صاحب بولے۔
"نہیں کیوں نہیں یقین کرتا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ قدرت کا کام کہانی لکھنا نہیں اس کو اور بھی کئی کام ہیں۔ اور ــــــ..... !"
میں بات کاٹ کر بولا۔ "میرا ہی نام سیٹھ بدری ناتھ ہے۔"
ماسٹر جی نے کچھ بھی خیال نہ کرتے ہوئے کہا۔
"تو میں نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔ آپ کی بیوی کا کیا نام تھا۔ ؟"
"منی ۔!"

ختم شد

کابلی والا

گُرُودیو را بندر ناتھ ٹیگور نہ صرف اس صدی کے بہت بڑے ادیب مانے جاتے ہیں بلکہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنہیں نوبل پرائز کا اعزاز بھی مِلا ۔ اُنہوں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں اور ناول بھی، اُن کی تصانیف کے نہ صرف ہندوستان کی تمام زبانوں میں ترجمے ہوئے بلکہ غیر ملکی زبانوں میں بھی وہ بہت مقبول ہیں ۔ ایسی عظیم شخصیت پر جہاں پورے ہندوستان کو ناز ہے وہاں سٹار پبلیکیشنز بھی اُن کی شہرۂ آفاق کہانیوں کا یہ مجموعہ پیش کرتے کا فخر محسوس کرتا ہے ۔